

UNIVERSAL  
LIBRARY

OU\_222082

UNIVERSAL  
LIBRARY



Osmania University Library

Call No. ۱۹۱,۴۴  
نہ پ

Accession No. ۵ 2679  
۶.

Author

نذر الاسلام

Title

پیام شباب

This book should be returned on or before the date last marked below.







سلسلہ انجمن ترقی اُردو و ہند ۱۲۳

# پیامِ شباب

یعنی

قاضی نذرا لاسلام کی بنگالی نظموں کے ترجمے

مترجمہ و مرتبہ

سید اختر حسین رائے پوری

شایع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

۱۹۳۹ء

خانصاحب عبداللطیف نے تطبیقی پریس دہلی میں چھاپا

اور

منیجر انجمن ترقی اردو ہند نے دہلی سے شائع کیا

# فہرست

نمبر شمار	نمبر صفحہ	نمبر شمار	نمبر صفحہ
۸۲	۵	(۱۵)	انتساب
۸۸	۷	(۱۶)	مقدمہ
			پہلا دور
۹۳	۲۵	(۱۷)	(۱) مجاہد کی صدا۔
۱۱۱	۳۸	(۱۸)	(۲) بانٹی۔
۱۱۵	۴۵	(۱۹)	(۳) طوفان آگیا۔
	۴۹		(۴) ڈوبتا ہوا اطلاق۔
۱۱۹	۵۱	(۲۰)	(۵) ناخدا۔
۱۲۱	۵۳	(۲۱)	(۶) اندھا دینوتا۔
۱۳۲	۵۵	(۲۲)	(۷) طاؤر صبح۔
۱۲۶	۵۸	(۲۳)	(۸) سکور اسرفیل۔
۱۳۰	۶۲	(۲۴)	(۹) کوئی زنجیر ہاتا ہے۔
۱۳۲	۶۷	(۲۵)	(۱۰) شامِ وطن۔
۱۳۶	۶۹	(۲۶)	(۱۱) جوانی اور پیری۔
۱۳۸	۷۳	(۲۷)	(۱۲) بیداری کا راگ۔
۱۴۱	۷۵	(۲۸)	(۱۳) افلاس سے خطاب۔
۱۴۲	۸۰	(۲۹)	(۱۴) میرے نغمے۔
			نعرۂ انقلاب



## مقدمہ

ہند جدید کی تاریخ میں جنگِ عظیم کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ قومی تحریکیں جو یہاں وہاں چھوٹے بڑے چشموں کی صورت میں بہ رہی تھیں اب ایک عمیق اور وسیع دریا کی شکل میں اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگتی ہیں قومیت ایک بہت بڑے گروہ کے لیے فلسفہٴ زندگی بن جاتی ہے اور حیات کے ان شعبوں پر بھی اپنا اثر ڈالنے لگتی ہے جو بظاہر مادی تحریکوں سے بے نیاز ہیں۔ ہندوستانی مصوری اور موسیقی کے لیے رجحان اس امر کے شاہد ہیں۔

ہماری قومیت کا تمدنی سانچہ بنگال میں تیار ہوا تھا۔ ہندو جہد کا سب سے پہلا ریفاہی راجہ رام موہن رائے وہیں پیدا ہوا۔ مغربی علوم و فنون کا چچا پہلے پہل وہیں شروع ہوا۔ اور ششہ کے بعد سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ جنہوں نے یورپ کے ریفارمیشن (Reformation) کی تحریک کا مطالعہ کیا اور انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تاریخِ زمان و مکان کی قید سے کتنی آزاد اور انسان کی جدوجہد کی کس قدر منبع ہے۔ ہزاروں میل کی دوری اور صدیوں کے فصل کے باوجود ارتقا کی وہی روش و نمونہ موقوفوں اور جگہوں میں اپنا کام کرتی ہے۔ یعنی یورپ میں سینکڑوں

سال پہلے جن سیاسی و اقتصادی مطالبات کی وجہ سے نشاۃ ثانیہ اور سماجی اصلاح کی مہم شروع ہوئی تھی، تقریباً وہی نظارہ اب بنگال نے دیکھا۔ فرق یہ تھا کہ ہندستان میں دو تمدن—ہندو اور مسلم—موجود تھے اور ان کے آگے ایک بدیسی سامراج کا خطرہ درپیش تھا۔ بنگال کی قومی تحریک نے ابتدا میں اس مثلث کو جس طریقے سے سلجھانا چاہا اُس کی مثال بنکم چٹرجی کے ناول ہیں۔ ان میں ہندستان کے لیے کسی واحد قومیت کا تخیل نہ تھا۔ مسلمانوں اور انگریزوں دونوں سے بیزاری تھی اور وطن کا وارت حقیقی ہندوؤں کو بتلایا گیا تھا۔ جنگِ عظیم تک یہ نقطہ نگاہ کم و بیش باقی رہا اور اُس کی صدائے بازگشت ہم دستوری تحریکوں میں ہی نہیں بلکہ ’گگ بانی‘ اور تلک اسکول کی انقلابی تحریروں میں بھی پاتے ہیں۔

ساتھ ہی ساتھ بنگال میں برہو سماج، رام کشن پرم مہنس دوپکانند وغیرہ کے باطنی، انسانیت پسند اور لبرل خیالات بھی مقبول تھے۔ دیانند کی ویدک اور تلک کی گیتا والی جاہلانہ تعلیم کے مقابلہ میں یہ لوگ اُپنشد کی امن پسند تعلیم کے علم بردار تھے۔ مگر دونوں کا مقصد ہندو نشاۃ ثانیہ اور قدیم ہندو تہذیب کی نئی زندگی تھی۔



بنگالی ادب کا موجودہ دور ”ٹیگور کا عہد“ کہلاتا ہے ٹیگور کی شخصیت نے بنگالی ادب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یوں تو

ادب کا ہر شعبہ اس کا منت پذیر ہے لیکن یہاں ہم صرف اُس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں۔

بنگالی مشرق کے اطلاوی کہے جاتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ تشبیہ صحیح بھی ہے۔ آب و ہوا نے ان دونوں قوموں میں رومان اور نغمے کی محبت پیدا کر دی ہے، اگر دونوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ امن پسند ہیں اور اُن تمام چیزوں کے جوگر جو یرسات اور گرمی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی زبانیں شیریں ہیں جن میں قدرے لسانیت ہے۔ اُن کا ادبی ذوق حقیقت کی طرف نہیں بلکہ رومان اور ابہام کی طرف جاتا ہے اور غالباً یہ سچ ہے کہ اطالیہ نے جتنے سینٹ اور بنگال نے جتنے سادھو اور سوامی پیدا کیے ہیں اتنے کہیں اور نہ ہوئے ہوں گے۔

ٹینگور کا کمال یہ نہیں تھا کہ اُس نے بنگال کی روح کو جلا دی بلکہ یہ کہ وہ بنگال کی روح کو پا گیا۔ بنگالی زبان کی غنائی خوبیوں کو اُس نے سنوارا اور وہاں کی آب و ہوا کو اُس نے اپنی نظموں میں سموایا۔ اُس کے لیے اُس نے مغربی اور قدیمی (سنسکرت) بچوں کو جس خوبصورتی سے اپنایا اور بیان کے لیے جیسے نادر اسلوب پیدا کیے اُن کا شمار ادب عالم کے شہپاروں میں ہو سکتا ہے۔ شاعری کے قالب سے قطع نظر کر کے اگر ٹینگور کے نفس مضمون کی طرف آئیے۔ یہاں ہم جمود اور بے حرکتی کا وہی تماشا دیکھتے ہیں جو گوتم بدھ اور ٹالسٹائی سے منسوب ہے۔ نظام زندگی کی بد عنوانیوں سے وہ تنگ تو ضرور ہے لیکن اس کا کوئی مدادا اُس کے پاس نہیں ہے

یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر سے آپ کسی دوا کی توقع کیوں رکھیں۔  
لیکن ٹیگور کسی نہ کسی صورت میں "دُعا" پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اگر  
کوئی مفکر ماضی و حال کی بے راہ روی کو سمجھے ہوئے بھی مستقبل  
کو دُعا کے سپرد کر دے تو اُسے کیا کہا جائے۔

ٹیگور نے امن و عافیت کا جو طلسم کھڑا کیا تھا اُس کے  
گنبدوں میں کبھی کبھی دہشت پسندوں کے بم گونج اُٹھتے تھے اور یہ  
معلوم ہوتا تھا کہ یہ خواب جو کالی داس کے عہد سے شروع ہوا  
ہے جلد ٹوٹنے والا ہے۔ لیکن جنگِ عظیم کے خاتمے تک کوئی قومی  
تحریک عوام تک نہ پہنچی اور متوسط طبقہ بھی کٹھم اُس سے متاثر  
نہ ہوا۔ ٹیگور کا جادو بنگال میں باقی رہا۔

عدم تعاون کی سیاسی تحریک ہماری تاریخ میں ایک اہم واقعہ  
ہی۔ اس لڑائی میں ہم نے جو حربے استعمال کیے اُن سے بحث  
نہیں۔ بلکہ یہ امر قابل غور ہے کہ انہیں استعمال کرنے والا ہمارا  
کسان تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تڑتوں سے سویا ہوا یہ کوہِ آتش نساں  
جاگ اُٹھا ہے اور اپنے بندھنوں کو ابھی توڑ کر پھینک دے گا۔

ہم سب کو وہ دن ابھی بھولے نہ ہوں گے۔ سیاسی ہنگاموں  
کا تو کہنا ہی کیا۔ پارسی تھیٹر بھی اندر سبحا اور ویلی مجنوں، کو  
پھوڑ کر سویشی اور سوراہ کے گیت گانے لگے تھے۔ قوالیوں اور  
کیرتنوں سے ہندو مسلم اتحاد کی صدا آتی تھی۔ شاعروں کا لشکر حکومت  
برطانیہ کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور وہ حضرات جنہوں نے  
غزل کی مشاطہ گری میں ڈاڑھیوں کے بال سفید کر لیے تھے،

اب مجاہدانِ ملت کے نئے روپ میں نظر آ رہے تھے۔  
 بنگال جو تمام قومی تحریکوں کا جنم داتا تھا، سجان کا خاموش  
 تماشائی نہ تھا۔ ہندستان میں بنگالی سے زیادہ وطن پرست کوئی  
 نہیں۔ اُس کا جوش اُس ندی کی طسرح ہی جس کی جوانی  
 مانسوں کے دم تک ہے۔ جب وہ امنک میں آتی ہے تو اپنے سامنے کسی  
 بند کو نہیں ٹکنے دیتی۔ اس ہنگامہ خیز دور میں وہاں جتنی سیاسی  
 تحریریں قلم بند ہوئیں ان کا شمار ناممکن ہے۔ یہ جوش تو آیا گیا ہوا،  
 جو چیز باقی رہ گئی وہ نیا دور تھا جو بنگال کے آرٹ اور ادب کی  
 دنیا میں شروع ہوا اور اب تک چلا جا رہا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے  
 کہ زمانہ بڑے بڑے ہنگاموں اور انقلابوں کی یاد صرف ان چند  
 لکیروں اور محاوروں میں چھوڑ جاتا ہے جو کسی ملک کے طرزِ تعمیر اور  
 طرزِ بیان میں رہ جاتے ہیں۔

اس نئے ادبی دور کے بانی اور علم بردار کا نام نذر الاسلام تھا۔

جنگِ عظیم کا زمانہ ہے۔ عراق کا میدان کارزار دن بھر گرم رہ  
 چکا ہے اور اب خدا خدا کر کے رات ہوئی ہے۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیر  
 ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز دشمن کی ٹوہ لینے کے لیے نیچے روشنی پھینکتے ہیں  
 دفعتاً بندوقوں کی آواز اور بموں کی شورش سے فضا گونج اٹھتی ہے۔ پھر  
 خاموشی چھا جاتی ہے۔ خندقوں میں سپاہی غفلت کی نیند سونے لگتے ہیں۔  
 مگر کسی خندق میں ایک سپاہی جاگ رہا ہے دن بھر موچے پر وہ  
 بڑی مستعدی سے لڑتا رہا ہے اور تھکان سے اُس کے بند بند ڈھیلے

پڑچکے ہیں۔ پھر بھی اُس کی آنکھوں سے نیند کالے کوسوں دور کیوں ہے؟  
 اس بے کلی اور بے چینی کی وجہ کیا ہے؟۔ اسے خود نہیں معلوم! تھوڑی  
 دُوری پر شط العرب کا دھارا تیزی سے بہ رہا ہے۔ سپاہی نذرالاسلام  
 صرف یہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کے دل میں کچھ جذبات موجزن ہیں  
 اور الفاظ کا لباس پہننا چاہتے ہیں اس سے پہلے اُس نے شاعری  
 کی باقاعدہ مشق نہیں کی تھی اور بحر و قوافی کے گروں سے ناواقف  
 تھا۔ لیکن یہ وہ عالم ہے جسے شاعر الہام، سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ  
 اندھیرے میں پنسل سے کاغذ پر کچھ لکھنے لگتا ہے اور صبح ان جملوں کو  
 دیکھ کر اس کے حیرت و تعجب کی حد نہیں رہتی۔ بلا ارادہ اُس نے  
 ایک نظم لکھ ڈالی ہے۔ یہ اُس کی پہلی مطبوعہ نظم "شاقی العرب" ہے۔  
 نذرالاسلام ایک گم نام کسان گھرانے کا فرد تھا۔ بردوان کے کسی  
 گاؤں میں آج سے ۴۲ سال پہلے وہ پیدا ہوا۔ قدرت نے اُسے پالا  
 اور غربت کے سرد مہر ہاتھوں نے اُس کی تربیت کی۔ اسکولوں اور  
 کالجوں کے عیش اُس کے نصیب میں نہ تھے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں  
 بھرتی ہو کر وہ عراق چلا گیا۔ اور سچ پوچھا جائے تو یہی میدان جنگ  
 اُس کے لیے سب سے بڑی تعلیم گاہ ثابت ہوا۔  
 جب وہ لڑائی کے میدان سے حالد بن کر ہندستان لوٹا تو  
 اُس کے ساتھ چند نظموں کا مسودہ بھی تھا۔ اس دوران میں یہاں  
 تحریک خلافت اور عدم تعاون کی سن گن شروع ہو چکی تھی۔ نذرالاسلام  
 نے دیکھا کہ جو آگ دل میں پھپکا کر وہ لایا ہے اُس کی پٹلیں ہر طرف  
 پھیلی ہوئی ہیں اور سارا ملک قربان گاہ بنا ہوا ہے۔

بدصیبی سے ہم مہنوز اُن اثرات اور اسباب سے نا آشنا ہیں جنہوں نے نذر الاسلام کے خیالات میں کایا پلٹ کر دی اور اُن کے اظہار کا ذریعہ شاعری کو بنایا۔ ہمارے استفسار کے جواب میں وہ کہتا ہے ”یہ کیوں پوچھتے ہو کہ طوفان کہاں اور کیوں کر پیدا ہوا؟“ تاہم میدانِ جنگ میں لکھی ہوئی ان نظموں کو پڑھ کر اور اُس کے ماحول کو دیکھ کر ہم اُس کے رُحمان کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اُن کا مجموعہ ”اگنی بنیا“ (آگ کی بانسری) کے نام سے شایع ہوا تھا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جن میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئی تھیں۔ یہ سب اسلامی روایات سے تعلق رکھتی ہیں اور اُن میں ہم اس مسلمان انقلابی کی جھلک دیکھ سکتے ہیں جس کی مثال اُس زمانے میں کیاب نہ تھی اور جو ہندستان سے زیادہ ترکی اور مالک عرب کی آزادی کا خواہاں تھا۔ جو بھی ہو، یہاں اُس کی فطرت کا اصلی جوہر ہمیں ملتا ہے، جو آزادی کی لگن اور ظلم کی نفرت ہے۔

اُس کے ماحول کو دیکھو تو وہ ایک مسلمان کسان کا بیٹا ہونے کے ساتھ سپاہی بھی ہے۔ کسان سپاہی میں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات پنہاں ہوتے ہیں بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہو جائے۔ کسان، مزدور اور سپاہی۔ ان تینوں کا اتحاد دُنیا کی تمام جاہر سلطنتوں کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ زار کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے مسلمان کی گرم گفتاری کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش۔ یہ تینوں چیزیں نذر الاسلام کو ولایت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی، سودہ بھی بعد میں پوری ہو گئی۔

ہندستان لٹنے کے بعد نذرالاسلام کو اپنے خیالات کی تہذیب اور مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد اُس نے وہ زندہ جاوید نظم ”ودروہی“ (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب کا علم بردار بنایا اور ”ودروہی کوئی“ (شاعر بغاوت) کا لقب دلایا۔ پروفیسر بے کما۔ سرکار اپنی تصنیف: ( Futurism of Asia ) میں اس نظم کا ذکر

کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”جب میں نے نذرالاسلام کی نظم ”باغی“ کو پڑھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا اُمڈ پڑا ہے۔ مسلمانوں نے اب تک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی ان پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی مدوح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید ان ہی کے سر بندھنے والا تھا“

بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ”باغی“ ہمارے ادب میں اپنی قسم کی اچھوتی چیز ہے۔ وکٹر ہوگرو (طوفان) سون برن (بہر تھا) اور لارڈ ہائرن (تخریب) جیسے بالکمال شاعروں نے اس موضوع پر سیر حاصل نہیں لکھی ہیں اور لٹکن کا ترانہ ”آزادی“ روسی انقلابیوں کے ورد زبان رہ چکا ہے۔ لیکن باغی کی رفعت اور عظمت ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس میں بلا کا زور ہے اور اُس کی خوبی ان اضداد میں مضمر ہے جن کے بوقلموں خمیر سے شاعر نے یہ ”آتشیں بت“ بنایا ہے۔

ابھی اُس کے خیالات میں وہ پختگی اور صفائی تو نہیں آئی ہے اور اُس کا نظریہ زندگی اتنا واضح نہیں ہے جس کی نظیر ”نعرہ انقلاب“

کی نظموں میں ملے گی مگر بغاوت کا ایسا رنگا رنگ اور مکمل خاکہ مشکل سے کہیں ملے گا۔

”آگمتی“ (آمد) اور ”دور وہی“ (باغی) ان دونوں نظموں نے بنگال کے ادبی حلقوں میں ہل چل مچادی۔ اخباروں میں مہینوں اُن کا چرچا رہا اور قدامت پسندوں نے ان پر سخت واویلا مچایا۔ ان کی نئی بحریں اور نئے مضامین ایک نئے دور کا اعلان کر رہے تھے۔ ٹیگور اسکول کے حامیوں کو یاد نہ رہا کہ کبھی اُنہوں نے بھی بنکم چٹرجی اور ڈی۔ ایل۔ رائے کی روایات کو توڑ کر اپنے لیے راستہ بنایا تھا۔ ان ادبی مباحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ جوان اور بڑھے دو حلقوں میں بٹ گئے اور اُن کے تنازعہ کی بنا نذرالاسلام کی شاعری قرار پائی۔

بنگلہ ادب کو نذرالاسلام کا عطیہ بڑا بیش قیمت تھا۔ سب سے بڑی چیز تو وہ سندس تھا جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن چابنازوں کا پیغام تھا جو انسانیت کی نجات کے لیے دیس پردیس میں سویلوں پر چڑھ رہے تھے اور کال کو ٹھہریوں میں مٹ رہے تھے۔ لیکن وہ اسلوب کم اہم نہ تھا جس میں اُس نے اس پیام کو پیش کیا شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرز یا اسلوب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔ نذرالاسلام اس راز کو سمجھا اور اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اُس نے جو لباس وضع کیا اُس کی سچ دھج ہی نرالی تھی۔ بنگلہ زبان کی نسوانی غنائیت کسی رزمیہ مضمون کے لیے زہرِ ہلاہل تھی۔ اور ٹیگور کے بنائے ہوئے سانچے اسن و آشتی کی ٹھنڈک

میں تو خوب کام دیتے تھے۔ لیکن عمل اور حرکت کی آہنج پڑتے ہی تڑخ جاتے تھے۔ یہاں فارسی کا وہ علم نذرالاسلام کے آڑے آیا جو اُس نے مکتبوں میں حاصل کیا تھا اور جس کی مشق اُس نے بعد میں بھی جاری رکھی تھی۔ وہ اُردو بھی کام آئی جو اُس نے کلکتہ کے بازاروں اور لڑائی کے میدانوں میں سیکھی تھی۔ اُس نے فارسی اور اُردو کے سبک الفاظ اپنی نظموں میں گھلنے شروع کیے تاکہ بیان میں خاطر خواہ زور پیدا ہو سکے۔ ادبی پاکبازوں ( Purists )

کے لیے یہ بہت بڑی بدعت تھی۔ گو کہ بنگلہ بولنے والوں کی زیادہ تعداد مسلمانوں پر مشتمل تھی اور وہ عربی اور فارسی سے استفادہ کرنے کے اُتے ہی مجاز تھے جتنا کہ ہندو سنسکرت سے، مگر جب نذرالاسلام نے ادبی ضروریات کی وجہ سے یہ جدت شروع کی تو اُسے فرقہ پرستی کا نام دیا گیا۔ بہر حال رفتہ رفتہ یہ رجحان بہت مقبول ہو گیا۔ اور اب تو اُس کے تبیح میں غزل نویسی بنگلہ شاعری کی خاص صنف بن گئی ہے۔

نذرالاسلام کی دوسری دین وہ رزمیہ موسیقی تھی جو اُس کے پیام کو پُر اثر بنانے کے لیے ضروری تھی۔ یہاں موسیقی کے اُس علم نے اُس کی مدد کی جو اُس نے لاکپن میں حاصل کیا تھا۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ ہندوستانی شاعری کے قالب کو بدلنے والے سب لوگ موسیقی کے ماہر ہیں۔ بنگلہ میں ٹیگور اور نذرالاسلام اور ہندی میں ”ہنت“ اور نرالا اس کی مثالیں ہیں۔ اُردو میں اب تک یہ تغیر نہ ہو سکنے کی وجہ شاید یہ ہے کہ اُردو داں تعلیم یافتہ طبقے

میں موسیقی کا چرچا نسبتاً کم ہے۔ علاوہ بریں اُردو بھروں کو دست دینے کے لیے ہندوستانی موسیقی کو جاننے کی آہنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ عربی و فارسی موسیقی کو۔ اور یہ ٹیڑھی کھیر ہے۔

پیغام کی نوعیت، زبان و بیان کی جدت اور طرز کلام کی توت — یہ وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے بہت کم عمری میں نذرالاسلام کو بنگال کا سب سے مقبول شاعر بنا دیا۔

اس قسم کی نظموں کی اشاعت کا یہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ ہمارے شاعر سے حولداری کی درومی چھن جائے اور اُس کی چھوٹی سی پنشن بند ہو جائے۔ یہی نہیں بلکہ حکومت نے اُس کی نظموں کے مجموعے بھی ضبط کرنے شروع کیے۔ چنانچہ اب تک وہ دو مرتبہ جیل کی ہوا کھا چکا ہے اور اُس کے پانچ مجموعے ضبط ہیں۔ ہندوستان کے کسی دوسرے شاعر کو یہ فخر حاصل نہیں۔

لیکن حکومت کا عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت اُس کا کیا بگاڑ سکتی تھی جسے قبول عام کی سند مل چکی ہو۔ اس نے ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیان ’کلاول‘ اور ’نوروز‘ کے نام سے دو ہفتہ وار اخبار نکالے۔ شروع میں تو یہ خوب چلے لیکن جب سیاسی ہنگاموں کی جگہ ہندو مسلم فسادوں نے لے لی تو انھیں کون پوچھتا۔ بند ہو جانے کے بعد بھی ’کلاول‘ کا اثر باقی رہا اور ’کلاول اسکول‘ کے ادیب یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لیے ایک خاص مقام بنا گئے۔ ان کی جدتوں اور بدعتوں نے ہندوؤں اور مولویوں کے حوروں کو ماتم کردہ بنا دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذرالاسلام کی سرکردگی میں سماجی

انقلاب کو اپنا اصلی مقصد بنایا۔ مگر کچھ اس راستے سے ہٹ گئے اور  
 ”جیمس جوتس“ اور فرائڈ سے متاثر ہو کر انھوں نے جنسی اصلاح کا  
 بیڑا اٹھایا۔ اس کا جو نتیجہ ہونا تھا وہ معلوم۔

یہ نذرالاسلام کی خوش نصیبی تھی کہ ٹیگور اسکول کی مخالفت کے  
 مقابلے میں اسے سی۔ آر۔ داس جیسے قدر شناس کی پشت پناہی مل  
 گئی۔ داس مرحوم بڑے وسیع القلب تھے اور ہونہار نوجوانوں پر ان کا  
 خاص اثرات رہتا تھا۔ خود شعر کہتے تھے اور ان کے کلام کا ایک مجموعہ  
 موجود ہے۔ ان کی جوصلہ افزائی نے ان کٹھن منزلوں میں نذرالاسلام کی  
 دہسری کی جن کی کھکھڑیں ہر باکمال کو ابتدا میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ  
 اُس کے ایسے شیدا تھے کہ اپنے انگریزی روزنامہ ”فارورڈ“

( Forward ) کے سیرورق پر اس کی بنگالی نظمیں چھاپا کرتے تھے۔

۱۹۲۲ء کا سال نذرالاسلام کے لیے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اس سے  
 پہلے اُس کے مشفق سی۔ آر۔ داس کا انتقال ہو چکا تھا۔ ادھر ہندو  
 مسلمانوں میں ہر طرف جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہر روادار انسان  
 مستعد نظیبن میں نگر بنا ہوا تھا۔ اس پر طرفہ یہ کہ اس نے انھیں دنوں  
 ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔ اس کے بعد تو فرقہ پرست اس کی  
 جان کے لالہ ہو گئے۔ اور ہر طرف سے اس پر اعتراضات کا ڈونگڑا  
 برس پڑا۔ حکومت کا نظم، مولویوں کا غیظ و غضب اور اب ہندو  
 جماعت کا ستم — اپنی ایک نظم میں وہ اس مرحلے کا ذکر کرتا ہے:۔  
 وہ میں زمانہ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔  
 کوئی کہتا ہے کہ اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔

کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔  
 کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جا کر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔  
 مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پا کر  
 مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے۔  
 ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے،  
 لہذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔

گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔  
 عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمن نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست  
 بتلاتے ہیں۔

غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔  
 لوگو مجھے اس کی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔  
 تنہا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلق خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں،  
 میری خونچکاں تحریر ان کے لیے پیام موت ثابت ہو۔“  
 اس وقت نذر الاسلام یہ آندھی بھی سہ گیا۔ اس زمانے کی زندگی  
 کا نقشہ اُس نے افلاس میں کھینچا ہے۔ وہ اسی لگن کے ساتھ اپنا کام  
 کرتا گیا۔ یہ ہمارے ادب کی کم نصیبی کہ روٹیوں کے لیے اسے وہ گت  
 لکھنے پڑے جو اب بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ اس ادنی  
 کاوش میں لامحالہ شاعری سے زیادہ موسیقی کو دخل تھا۔ اور یہ شاعر  
 کا نہیں ’نغمہ ساز‘ کا کام تھا۔ آہستہ آہستہ یہ رنگ زور پکڑتا گیا۔ اور  
 اب اس کی شاعری پر کیسر غالب ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کی  
 انقلابی شاعری ۱۹۲۶ء میں شروع ہو کر ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ سرد ہو گئی

اس قسم کی جدوجہد اپنے ماحول سے زیادہ عرصہ تک الگ نہیں رہ سکتی  
 چرچہ اور کھادی کے ساتھ انقلاب کے گیت نہیں گائے جاتے۔



نذرالاسلام کی شاعری تین ارتقائی منزلوں سے گزری ہو ابتدائی  
 دور جو بہت مختصر اور کم اہم تھا اس اسلامی اثر کا شاہد ہو جو تحریک  
 خلافت کے دنوں میں ہر مسلمان پر چھایا ہوا تھا اس زمانے میں اس  
 نے جو نظمیں لکھیں ان میں انور پاشا اور مصطفیٰ کمال پر دو چھوٹے  
 چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے تھے۔ ان کا سارا لطف حسن بیان میں  
 مضمر ہے جس کا ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ معرکہ کربلا وغیرہ پر بھی چند  
 نظمیں ہیں۔

دوسرا دور جو سب سے طویل اور اہم ہو "باغی" کی اشاعت  
 کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی نظموں کا انتخاب ہم نے  
 "مجاہد کی صدا" کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ جوش اور اُمنگ کا زمانہ  
 تھا اور اس پر اس ماحول کا اثر تھا جس نے بنگال کے بہت سے  
 نوجوانوں کو بم بازی اور دار و سن کی طرف کھینچا تھا۔

تیسرا دور جو ستمبر کے لگ بھگ شروع ہوا۔ سب سے زیادہ  
 اہم ہے۔ اس اعتبار سے کہ اس زمانے میں اسے غور و خوض کا موقع ملا  
 اور وہ اشتراکیت کے ضد و خال کو جانچ پرکھ سکا۔ اسے وہ فلسفہ زندگی  
 اب چاکر ملا جس کی تلاش میں وہ برسوں سے بھٹک رہا تھا۔ لغزہ  
 "انقلاب" کے تحت کی نظمیں بتلائیں گی کہ اُس نے اپنے موضوع کا  
 مطالعہ کیا ہے۔ اور اس ضمن میں ایسے ایسے نازک نکتے بیان کر گیا ہے

جو نظر بینی کے طالب ہیں۔

مگر اس ساری مدت میں اس تناور درخت سے وہ امر بیل لپٹی ہوئی تھی جو کسی فن کار کو بے داغ نہیں چھوڑتی۔ اس کا نام ”رومان پسندی“ یا ”بہسیت“ ہے۔ جنگال کی سر زمین اس بیل کی نشوونما کے لیے موزوں ہے۔ وہاں کے اودے اودے بادلوں، گھنیرے پتروں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے رومان مسکراتا ہے۔ نذرالاسلام پر بھی یہ جادو چل ہی گیا۔ اس کا ہلکا سا پرتو ان تینوں نظموں میں ملے گا جو ”یاد ایام“ کے نام سے اس مجموعے میں شامل کی گئی ہیں۔ لیکن سچ پچھا جائے تو اس رجحان کا اثر بہت دور رس تھا۔

•••

ابھی ہم نذرالاسلام کے قریب اور اس منزل سے دور ہیں جس کی چھب دکھانے وہ آیا تھا۔ جب ہم اپنے تمدنی ورثہ کو تنقید کی آگ پر پرکھیں گے تو وہ ہمیں ادبِ جدید کے پیغمبر کی صورت میں نظر آئے گا۔ یہ اس لیے کہ ہماری شاعری میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے ہمارے اقتدار کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس لحاظ سے کہ زندگی کی رتو پیچھے کی طرف نہیں بلکہ آگے کی طرف بڑھے جب وہ بار بار جوانی اور پیری کے تنازعہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کا مدعا وہ نئی تہذیب ہے جو پڑانے کھنڈروں کو توڑ کر اپنا گھر بنا رہی ہے۔ یہ وہ سرمایہ دارانہ ”مغربی“ تہذیب نہیں ہے جو آقا اور غلام کے پرانے رشتے کو مالک اور مزدور کے نئے نئے میں گوندھتی ہے بلکہ وہ نئی تہذیب جو قوم و مذہب، رنگ و نسل کی سرحدوں کو توڑ کر دنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتی ہے۔ اس ہم کی

فتح یابی کا ترانہ شاعریوں گاتا ہے۔  
”وہ مبارک ساعت آہنچی۔“

ہتوڑی اور کڈالی سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے،  
راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،  
تھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے،  
تھارا بارگناہ اٹھانے کے لیے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے،  
وہی - صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اُسی کے گیت گاتا  
ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دنیا کی تعمیر کرے گا۔ \* \* \* \*  
آج مظلوموں اور بے کسوں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی سے  
آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔ \* \* \* \*

آج دنیا کے بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان دور  
بیداری کا آغاز ہو رہا ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے اور شیطان  
خوف سے لرزتا ہے۔“

نذر الاسلام کا نظریہ یہ ہے کہ زندگی دائم و قائم ہے اور انسان لاشرکیہ!  
اس کا کارساز ہے۔ وہ شباب کا ہم دوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ  
تغیر کا حامی اور جہود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید کا  
علم بردار ہے۔ وہ قدرت اور سلج کے مظالم کے خلاف علم بغاوت بلند  
کرتا ہے اور شاعری کو اس ہمہ میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس  
کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔

ہندستان کی شاعری میں یہ ایک نیا خیال ہے۔ اب تک  
ہم زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا نوحہ سنتے آتے تھے

اور ہمارا ایمان واضح تھا کہ حقیقت صرف موت کے بعد مل سکتی ہے۔ صرف ایک مرتبہ کبیر داس نے دہلی زبان میں کہا تھا کہ جو چیز زندگی میں نہیں مل سکتی وہ موت میں کیوں کر مل سکتی ہے۔ لیکن ہم نے اُس کے ماننے والوں کو چار بنا کر چھوڑ دیا۔ اور پھر قضا و فنا کی حمد گانے لگے۔ اب پہلی بار ایک شاعر نے اس ذہنی غلامی کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا اور ادبی انقلاب کی ایسی طرح ڈالی کہ اس کی ریک پر آج ہر طرف آتش کدے روشن ہو رہے ہیں۔

نذر الاسلام نے دومی کا پردہ اٹھانے کی لا حاصل کوشش کبھی نہ کی۔ اس معاملے میں اُس نے گوتم بدھ کے اس صائب منشور پر عمل کیا کہ جو اس جھیلے میں پھنسا وہ پاگل ہو کر رہے گا۔ اس نے صرف دنیوی زندگی اور اُس کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں اپنی صلاحیت صرف کی۔ اس سے بڑی عبادت اور کیا ہو سکتی ہے؟۔ زندگی کی تلخیوں سے متہ پڑانا بہت آسان ہے اور صوفیوں کی قبا بہت سے داموں بازار میں مل جاتی ہے۔ لیکن مجاہد کا ذہنی کفن ہر کسی کے نصیب میں نہیں۔

یہ رتبہ بلند بلا جس کو مل گیا

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زندگی کی ہر وادی میں چل پھر کر اُس نے یہی دیکھا کہ دنیا دو چھاوٹیوں میں بیٹھی ہوئی ہے۔ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جہالت اور افلاس میں گھٹ رہی ہے۔ اور دوسری طرف اُس کی محنت کا پھل تھوڑے سے تن آسان ہڑب کر رہے ہیں۔ حیند

سرفروش ہر دور میں اس ظلم پرور نظام کو بدلنے کے لیے لڑتے ہیں  
نذر الاسلام صرف انہیں کا تناخاں ہے۔ ”باغی“ اسی مجاہد کا ترانہ ہے  
اور اتنا عظیم الشان ترانہ کہ اسے سن کر ہم مبہوت سے رہ جاتے ہیں  
دیور تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف تاریکی ہے اور بادلوں میں ایک  
بکلی تڑپ رہی ہے۔

یہ نیا بدظلم اور بے انصافی کے نظاروں کو دیکھ دیکھ کر انتقام  
کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔ اس کی ذہنی کیفیت کا نقشہ روسی ناول  
ننگار ”ترجیبت“ نے اپنے شاہکار ( Fathers and Children )

میں کھینچا ہے۔ جب اُس کا ہیرو مرتا ہے تو ایک  
نقاد کہتا ہے، ”وہ بربادی جو برباد کرتے کرتے خود برباد ہوگئی، کیسا  
نذر الاسلام کا ہیرو بھی تخریب و تباہی کے سوا کچھ نہیں چاہتا؛ —  
”سارہ تخریب“ فضا میں ہول اور ہراس کے سوا کچھ باقی نہیں چھوڑتا  
معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز مرگئی، مٹ گئی، مڑجھا گئی —

لیکن یہ ایک عارضی کیفیت ہے۔ مستقبل جذبہ اُس تعمیر کا ہے جس  
کا خواب ہم ”نعرہ انقلاب“ کے آخری بندوں میں دیکھتے ہیں۔ وہ  
رہ کر اُمید کی یہ کرن شاعر کے اندھیرے ماحول کو اجالتی ہے اور  
شک و شبہ کے اُس منجدھار سے نکالتی ہے جسے ہم ”ناخدا“ میں  
پاتے ہیں۔

وہنت پسندی اور انٹر اکیٹ کے بیچ میں جو دور تغیر ہے اس  
سے انقلاب پرور دیر میں گزرتا ہے اور اُس کے لیے بڑے ضبط اور

توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کی انقلابی تحریک اس پُر خار  
راہ سے کس طرح گزری اس کا مُرّج ہمیں ان نظموں میں ملے گا۔  
وہ ”باغی“ جو سرہیلی پرے کر نکلا تھا بیچ میں مجروح ہو کر۔ تھک کر  
نہیں گر پڑا:

”صبح تک وہ مُسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اُس اندھیری  
رات کو تلامخیز دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی“

اب شاعر اپنی منزل سے بھٹکنے لگتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ اشتراکیت  
کی چند کتابیں الماریوں میں رکھی ہیں اور کچھ آرام طلب دیوانخانوں  
میں انقلاب زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن نظریہ اور  
عمل کے درمیان ایک حد فاصل ہے جس کے طے ہونے میں ابھی دیر  
ہے۔ تو شاعر بھی تھک کر راستے میں بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن شراب و  
شباب کی مصیبت میں گرفتار ہو کر بھی وہ اپنے مقصد کو نہیں بھوتتا  
”یاد ایام“ میں اس ردِ عمل کا ذکر یوں کرتا ہے:

”معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔

کیوں نہ اب میں موت در آغوش طوفان کا ہم سمنبر  
بن جاؤں ہے۔ راستے میں کس کی یاد میں فریاد کرتا پھروں  
کیوں نہ آتش فشاں پہاڑ اپنے غارتگر دہانے کھول دیں  
کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرے  
اور موت کے گیت میرے ہم سخن ہو جائیں“

دومرتبہ جیل جانے اور کلام کے کئی مجموعے ضبط ہو جانے کے بعد  
بھی اُس کے استقلال میں فرق نہیں آتا:-

” اسی خالقِ جدید! تیرے استادے پر میں کس غم و ہتھال سے  
 سے اسی راہ پر چلتا رہا ہوں۔ جب تو نے مجھے پکارا مجھے  
 یہی جواب ملا کہ ہاں ہاں میں ثابت قدم ہوں“

تھوڑے عرصے سے وہ پھر بیجا سا ہر اور وہ گیت ہم نے نہیں  
 سنے جنہوں نے شباب کے خون کو گرمایا اور اُس کے دل کو دھڑکایا  
 تھا۔ لیکن یہ ایک وقفہ ہی اور عجب نہیں کہ جب ”آزادی کے  
 سپاہی“ وزارتوں کی گدیوں کو خالی کر کے اپنے اصلی مورچوں پر لوٹ  
 جائیں تو بنگال کا باغی شاعر ایک مرتبہ پھر جاگ جائے اور اپنے  
 روح پرور لغنوں سے ملک کو تھرا دے۔



کئی سال پہلے جب ہم نے رسالہ اُردو کے لیے نذر اسلام  
 کی بعض نظموں کے ترجمے کیے تو اُس کے ایڈیٹر نے اپنے نوٹ میں  
 لکھا تھا: ”ہندستان کی کسی زبان میں اس قیامت خیز قوت کا  
 کوئی شاعر نہیں پایا جاتا۔ اس کے کلام میں ایک آگ بھری ہوئی  
 ہے جس کے سامنے عامیانه خیالات اور ہماری شاعری کے مضامین  
 گھاس پھوس معلوم ہوتے ہیں“

در اصل اس کی شاعری کا کمال اس کی قوت میں مضمر ہے۔  
 ترجمہ اس کے بیان اور تخیل کا تو ہو سکتا ہے لیکن اُس کی موسیقی  
 کا نور ترجمے کی پابندیوں سے آزاد ہے۔ یہ موسیقی کبھی طوفان خیز لہروں  
 کی طرح دھاڑتی اور کبھی لڑکے آتشیں جھونکوں کی طرح سنسناتی ہے  
 کبھی وہ آسمان بوس پہاڑوں کی طرح اپنی شوکت سے آپ مبہوت

ہو جاتی ہے۔ مثلاً ”آگنی“ (آمد) نامی نظم کو لیجیے۔ اس میں میدانِ جنگ کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا گیا ہے۔ گرمی بیان کا یہ حال ہے کہ میدان کے شور و شغب کا ہنگامہ کانوں تک پہنچتا ہے۔ زور الفاظ کا اس سے بہتر نمونہ پیش کرنا دشوار ہے۔ گو کہ رسم الخط بنگلہ تلفظ کو تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔ پھر بھی ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے

اے کی رن یا جا باجے گھن گھن  
 جھن رن رن رن جھن جھن جھن!  
 لیکی دکلی دکلی ، دھکی دھکی  
 داما دریمی دریمی گمکی گمکی  
 اوٹھے چھوٹے پھوٹے  
 چھوٹے لوٹے پھوٹے!  
 پھنکی چسکی چسکی  
 بہنی  
 ڈھال تلوارے گھن گھن !!  
 اے کی رن یا جا باجے گھن گھن  
 رن جھن جھن - رن جھن جھن!

ہندوستانی زبانوں میں آہا اودل کے رزم نامہ کے علاوہ شکوہ الفاظ کا یہ نمونہ اور کہیں نہیں ملے گا۔  
 دوسرا بڑا کمال یہ ہے کہ اُس کی قوت بے حسن نہیں ہے۔ اُردو زبان میں ادھر بہتری انقلابی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ ان میں خالی خولی جوش کی اتنی بھرمار ہے کہ یادِ سموم کا سارا زور ختم ہو جاتا ہے ، ہمارے حصے میں صرف دھول اور ریت رہ جاتی ہے۔ رزمیہ موسیقی

کے بدلے وہ آوازیں سنائی دیتی ہیں جو پہلوان ڈنڈ پلٹے وقت نکالتے ہیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ ان انقلابی مضامین کو نذرالاسلام نے ادب پارے کیسے بنا دیا ہے۔ تخیل کی یہ پرواز کیسے باقی رہی ہے۔ تصور کی یہ رنگینی پھیلی کیوں نہ ہوئی؟ یہ آگ جلتے جلتے بھی اپنی شعاعوں میں ہمواری کیسے باقی رکھتی ہے؟ یہ طوفان گرجتے گرجتے بھی اپنے تال سم کو بگڑنے کیوں نہیں دیتا؟۔ ”باغی“ سے زیادہ زور دار اور ساتھ ہی ساتھ خوبصورت نظم کہاں ملے گی؟ یہ باغی یونان کا رستم ہرکلس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ ٹوٹی تھیں۔ بلکہ ”ہومر“ کا تنکیل و جمیل ہیرو اکیلیس ہے جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اُس کے مد بھرے نینوں میں۔

جب ہم اُس کے کلام کو پڑھتے ہیں تو اُس کے خیالات سے اتفاق کریں یا نہ کریں اُس کی تحریک کی تائید کریں یا نہ کریں لیکن اُس کے خلوص کا سیکہ ہمارے دل پر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کی سرخوشی کے آگے ہمارا سر ادب سے جھک جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کبھی کبھی وہ اپنی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ لیکن اس راہ روی میں لطف ہی کیا اور ایسے ہم سفر کا ساتھ ہی کیا جس نے کبھی ٹھوکر نہیں کھائی اور کبھی راہ نہ بھولا اس وقت ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ یہ راستہ کتنا دشوار ہے اور اس پر چلنے والے کتنے گئے چنے لوگ ہیں۔ ان میں سے کوئی اگر تھک کر دم بھر کے بے بیٹھ جائے یا کوئی گھائل ہو کر گر پڑے تو وہ ہماری ہمدردی کا مستحق ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ نذرالاسلام ظلم اور ظالم کا دشمن ہے۔ اور وہ ہر انسان و خیال کو اسی کوٹھی پر کستا ہے۔ اگر کذب و افترا کی تنقید میں وہ کبھی درستی سے کام لیتا ہے تو اُس کے معنی یہ نہیں کہ اس کا واحد مقصد کسی عقیدے کی ہتک ہے۔ میدانِ جنگ میں فحشیل پر بیٹھنے والوں کو ہوشیار رہنا ہی پڑے گا۔ ادھر ادھر سے ایک آدھ نشانہ اُنہیں آہی لگے گا۔ ایسے موقع پر تماشِ بین کو اس خد فریبی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ میدان کا مرد وہی ہے اور سارے نشانے اُسی پر لگائے جا رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا ہے کہ ایٹانے جو جمہوریت کی نعمتوں سے ہمیشہ محروم رہا، اگر کبھی تحریر کی آزادی دی تو صرف اپنے شاعر کو۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر شاعر شراب پھیننے والے خدا پر چٹنگ زنی کرے تو ہم ہنس کر ٹال دیں اور اگر روٹی پھیننے والے خدا پر چسپیں بچیں ہو تو ہم اس غریب پر جریں تاننے لگیں۔



ہم نے دیکھا کہ جب ہمارے ملک کی ترقی پسند تحریک قومیت سے بڑھ کر اشتراکیت کی راہ ڈھونڈ رہی تھی تو ادب میں اس رجحان کی علم برداری نذرالاسلام نے کی۔ اسی طرح ادب کے قالب میں اُس نے یہ تبدیلی کی کہ میگور کی ابہام پسندی کو چھوڑ کر مضمون کی خارجیت اور اسلوب کے حسن کا وہ امتزاج کیا جسے رومانی حقیقت پسندی کہتے ہیں اور جو گورکی مرحوم کا خاص وصف تھا۔

اگر ہم یہ مان لیں کہ میگور نے دانستہ کسی فلسفہ زندگی کی تلقین نہیں کی تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہند جدید کے دو سب سے

بڑے مفکر شاعر۔ اقبال اور نذرا لاسلام مسلمان تھے۔ گو وہ دو متضاد رجحانوں کے پینٹوا تھے لیکن انھیں وہ بے چینی متحرک کر رہی تھی جو مسلمانوں کے وجود کو دیکھ کر ہر ذمی حس میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں رجحان دو مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ایک پیچھے کی طرف بلاتا تھا اور دوسرا آگے کی طرف بڑھاتا تھا۔ لیکن دونوں حرکت اور عمل کی دعوت دیتے تھے اور سرمایہ داری و سامراج کے دشمن تھے۔ ہندستانی شاعری کو ان دونوں کی ایک بڑی دین یہ بھی تھی کہ اس میں انھوں نے زندگی کے مقاصد کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا کی۔

اس مجموعے کی تکمیل کے وقت ہمیں یاد آتا ہے کہ اس کی چند نظمیں ایک موقع پر ہم نے اقبال مرحوم کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہم سے دیر تک نذرا لاسلام کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمائش کی کہ انھیں کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ افسوس کہ اقبال آج ہم میں نہیں ہیں۔ وہ نذرا لاسلام کے خیالات کے سخت مخالف تھے لیکن اس کے شاعرانہ کمال کے بڑے معترف تھے۔ اس کاوش کی وہ یقیناً داد دیتے۔!

یہ کہا جا چکا ہے کہ نذرا لاسلام کے انقلابی کلام کا بیشتر حصہ ضبط ہے۔ ادبی نقطہ نظر سے یہ کلام انمول ہے۔ اب جب کہ ہر طرف "رام راج" کی ہوا چل رہی ہے۔ اچھا ہو اگر ان پر سے تحدید ہٹائی جائے۔

فی الحال ہمارے تراجم کا دائرہ ان نظموں تک محدود ہے جو بازار میں بکتی ہیں۔ ان کے انتخاب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

آج سے چھو سات سال پہلے جب ہم نے اردو داں جلتے سے

اس شاعر کا تعارف کرایا تو لوگوں کی حیرت کی حد نہ رہی۔ یہ تراجم بڑے شوق سے پڑھے گئے اور ہم سے متعدد مرتبہ انھیں مجموعے کی صورت میں چھپوا دینے کی فرمائش کی گئی۔ خدا خدا کر کے وہ ساعت اب آئی۔ ان میں سے کئی نظموں کے تراجم غیر مطبوعہ ہیں۔



نذرا لاسلام کا پیغام مذہب و ملت کی قیود سے آزاد ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کے خواب کی تعبیر کبھی نظر آئے اور پھر اُس کے گیت پڑانے ہو جائیں۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ دنیا میں مجاہدوں اور شہیدوں کی ضرورت یکسر نہ سہے گی۔ بفرض محال کبھی ایسا ہوا بھی تو نذرا لاسلام سے زیادہ کسی کو خوشی نہ ہوگی۔ خود کہتا ہے ”میں دورِ حاضر کا شاعر ہوں مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔ آنے والا زمانہ مجھے یاد کرے گا یا نہیں اس کی مجھے پروا نہیں“

وہ اپنی نسل کی خدمت اس بے کرسکا کہ اُس نے ابد کی ڈائری میں اپنا نام ٹانکنے کی کوشش نہیں کی۔

اختر حسین رائے پوری  
لندن ۱۰ نومبر ۱۹۹۷ء



پتلا دور  
مجاہد کی صدا



## مجاہد کی صدا

پُر آشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہونڈا کا آندھیاں شاہد ہیں  
 کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو میں نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔  
 میرے نعشِ قدم کو دیکھنے کے لیے کالے بادلوں میں بجلیاں  
 مچلتی ہیں۔

اور میری پرچھائیں کے نیچے اُجڑے ہوئے راستوں میں نو بہار  
 کونپلیں اُگنے لگتی ہیں۔

میرے نوجوں کو سُن کر گورِ غریباں کے چراغ پھر سے زندگی  
 کا سانس لیتے ہیں۔

اور میں چغماق کی طرح ہر گھر میں آگ جلاتا جاتا ہوں۔  
 نئی زندگی فرات کے دھارے کی طرح بہ رہی ہے۔  
 لیکن اس کا ساحلِ قربانی کا پیا سا ہے۔

ظلم کے لشکرِ موج در موج چڑھے آتے ہیں۔  
 اور میں عباس کی طرح اس دریا کو اپنی تشنہ لہی کا پیمانہ  
 مٹانے جا رہا ہوں۔

جب کوئی فرعون کسی موسیٰ کو مٹانے نکلتا ہے  
 تو میں نیل کا سیلاب بن کر اُسے فنا کر دیتا ہوں۔  
 جب کوئی نمرود کسی ابراہیم کے نعرہ حق کو موسنا چاہتا ہے۔  
 تو میں آتش کدہ کو گُل کدہ بنا دیتا ہوں۔

پُراشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہولناک آنڈھیاں شاہد ہیں  
 کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو میں نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔  
 اپنے سہمے ہوئے وطن کو میں جرات کا درس دیتا ہوں۔  
 اور پیری میں سدا بہار جوانی کے ولولے پیدا کرتا ہوں۔  
 اور میری جاں بازی روشن میناروں سے طوفانوں کی آرتی  
 اُتارتی ہے۔

نئی زندگی کے مسافر اسی راہ سے گزریں گے۔  
 اس آس پر میں اس پُرخار ڈگر پر اپنا سکہ ڈکھ، جان مال سب  
 کچھ لٹائے جاتا ہوں۔

سب مستقبل کی کوئی شام آنادی کا پرچم لہراتے ہوئے اس  
 طرف آئے

تو لوگو! ایک نظر آسمان کی طرف بھی دیکھ لینا۔  
 میں تمہیں ستاروں کی محفل میں مسکراتا ہوا دکھائی پڑوں گا۔  
 پُراشوب گھٹائیں، تاریک راتیں اور ہولناک آنڈھیاں شاہد  
 ہیں کہ اپنی ٹوٹی ہوئی کشتی کو میں نے لہروں کے سپرد کر دیا ہے۔

## باغی

کہہ دے! ای جواں مرد کہہ دے کہ میں سر بلند ہوں۔  
 اتنا بلند، اتنا بلند، کہ ہالیہ کی چوٹی بھی میرے آگے نرنگوں پر  
 کہہ دے! ای بہادر کہہ دے کہ اس وسیع آسمان کو چیر کر چاند سلوج  
 اور ستاروں کو توڑ کر، جنت و دوزخ کو دہلا کر اور عرش سے  
 ٹکرا کر

میں اس دنیا کے لیے مجسمہ حیرت بن گیا ہوں۔  
 کہہ دے! ای جواں مرد کہہ دے کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا۔  
 میں سرکش، سنگ دل اور آتش زباں ہوں۔  
 میں قیامت کا ندیم ہوں۔ طوفان ہوں، تباہی ہوں، دہشت  
 ہوں۔ میں دنیا کے لیے سراپا ہلاکت ہوں۔  
 ہر چیز کو چلنا چور کر دیتا ہوں! لاادبالی ہوں، اصول شکن ہوں۔  
 قانون، قاعدوں اور پابندیوں کو پاؤں کے نیچے روند ڈالتا  
 ہوں۔

میں یربادی کا دیوتا ہوں۔ موسم ہو یا نہ ہو موسلا دھار برکھا  
 پڑسا دیتا ہوں۔

کہہ دے! ای جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔  
 میں باغی ہوں! مادہ گستی کی سرکش اولاد!  
 میں ہوں بادِ سموم اور لاکا گرم جھونکا۔  
 میری راہ میں جو چیز حائل ہوتی ہی اُسے میں چوڑے چوڑے کر ڈالتا ہوں

میں وحشیوں کا رقص ہوں! اپنے تال پر میں آپ ہی ناپنے  
گلتا ہوں۔

سماج کی بندشوں سے آزاد ہو چکا ہوں۔

میں سپاہیوں کا گیت ہوں! میں آتش نوا موسیقی ہوں۔

میں سرب صمرا ہوں۔

چلتا ہوں اور ٹھٹکتا ہوں۔ سنبھلتا ہوں اور لڑکھڑاتا ہوں۔

ایک ایک قدم پر ہزاروں لغزشیں۔

میں مضطرب برق سوزاں ہوں۔

جو دل میں آتا ہی کرتا ہوں۔

دشمن سے تکرار کرتا ہوں اور موت سے ہر دم آزمائشی میرا کھیل ہی

مہلک مرض ہوں، وبا ہوں، ایک عالم گیر خطرہ ہوں!

حکومتوں کے لیے آفت کا کوہِ آتش فشاں!۔

غارت گر ہوں — تند خو ہمیشہ بے قرار!

کہ دے! ای جواں مرد کہ دے کہ میں سر بلند ہوں۔

میں ہوں سرمست ازلی اور رند خانہ خراب جس کا کوئی طاقت

کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

میرا پیمانہ زندگی ہمیشہ جھلکتا رہتا ہی۔ میں قربان گاہ کی آگ ہوں

میں خود ہی آتش ہوں اور خود ہی آتش پرست!

میں ہی تخلیق ہوں اور میں ہی تخریب!

میں شہر آباد ہوں اور شہرِ خموشاں!

لیلائے شب کا قاصد ہوں!

دیوتاؤں کی مکہ کا نذرِ نظر ہوں۔

میری مٹھی میں چاند ہی اور پیشانی پر سورج جگمگاتا ہے۔  
ایک ہاتھ میں سرٹلی بانسری ہے اور دوسرے میں لڑائی کا بگل  
میں وہ مہادیو ہوں جس نے سمندر کو کھنگال کر زہر ہلاہل نکالا  
اور آسے خود ہی پی لیا۔

میں وہ مہادیو ہوں جس نے گنگا کو اپنی زلفوں میں قسب  
کر رکھا ہے۔

اپنی خودی کے علاوہ میں کسی کے آگے سر نہیں جھکاتا۔  
میں کوندے کی لپک اور بھلی کی چمک ہوں!  
میں صور اسرافیل کی صدائے بازگشت ہوں۔

قیامت کے دیوتا کا پرچم اور جبرئیل کا عصا ہوں!  
میں ان پیغمبروں کا پُجاری ہوں جن کی چین جبیں ایک عالم  
کو تہ و بالا کر ڈالتی تھی۔

میں آتش کا پرکالہ ہوں! اس دنیا کو جلا کر خاک کر دوں گا!  
میں وہ قہقہہ ہوں جو روح سے نکلتا ہے۔  
میں اس یوسیدہ سماج کا دشمن اور اس کے لیے غمخوار غمخیز ہوں  
میں آفتاب کی پیشی ہوں۔

لہ ہندو دیومالا کا ایک قصہ کہ سب دیوتاؤں نے سمندر کو کھنگال کر اس میں  
چودہ جوہر نکالے جن میں آپ حیات بھی تھا اور زہر بھی۔ امرت پتہ  
دائے تو سب تھے لیکن زہر کو کون چکھتا۔ آخر مہادیو جی نے یہ کڑوا  
گھونٹ گئے سے نیچے اتارا۔

کبھی پُر امن ہوں تو کبھی قسرا انگیز۔  
 میں وہ نوجوان ہوں جس کی رگوں میں تازہ خون بہتا ہے!  
 میں وہ ہوں جو دنیا کا غرور توڑ دیتا ہے۔  
 کہ دے! اسی جہاں مرد کہ دے کہ میں ہمالیہ سے بھی بلند ہوں۔  
 میں لو کی لپٹ ہوں اور دریا کی پُر شور روانی۔  
 میں روشن ہوں آگ کی طرح!  
 میں بہتے ہوئے پانی کی آواز ہوں۔ چنیل موجوں کی شیریں  
 راگنی۔

کسی دوشیزہ کی زلف پریشانی کا جوڑا ہوں، ترچھی آنکھوں  
 کا تیر ہوں۔

کسی سینہ کا اولین بوسہ ہوں، آفریں ہی مجھ پر!  
 کسی غم رسیدہ کا دلِ بقرار ہوں! کسی بیوہ کے دل کی آہ  
 ہوں۔ کسی ٹوٹے ہوئے دل کی پیکار ہوں۔  
 میں اُس مسافر کا غم ہوں جو ہمیشہ کے لیے مارا مارا پھر رہا ہو۔  
 کسی دلِ جلے کی پیکار ہوں! نہر کی تلخی ہوں!  
 محبوب نے جس دل کو ٹھکرا دیا ہو اُس کی دھڑکن ہوں!  
 کسی مغرور اور غضبناک دل کی بے کسی ہوں۔  
 وہ درد ہوں جو دل پر چھا گیا ہو۔

پہلے بوسے کے بعد دوشیزہ کے جسم میں پیدا ہونے والی  
 تھر تھری ہوں۔

کسی پردہ نشین معشوق کی سہمی ہوئی نگاہ ہوں جو شرارت

سے دیکھنے کے بعد بھی یوں آنکھ چڑالیتی ہو گویا دیکھا ہی نہیں۔  
کسی چنچل چت چور کا عشق ہوں اور اُس کی چوڑی کی سیٹھی  
جھٹکار!

میرا بچپن اور جوانی دائمی ہے۔

جو دیہاتی لڑکی جوانی کے بوجھ سے دبی جاتی ہے میں اُس کے  
داسن کا پخوڑ ہوں۔

کہ دے! اے جہاں مرد کہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔  
میں بادِ زمہریہ بھی ہوں اور بادِ سموم بھی۔  
میں اُس شاعر کا متین ترانہ ہوں جو راہ طو کر رہا ہے اور  
بالسری پر گیت گاتا جاتا رہا ہے۔

میں ایک بے قرار اور پریشان دل ہوں۔

میں وہ سوجھ ہوں جو آگ برساتا ہے۔

ریگستانی آبشار کی روانی ہوں! دیوانہ وار بھاگا جا رہا ہوں۔

میں وہ وحشت ہوں! اور بے ہوش قلب کا ہوش ہوں۔

میں ترقی اور پستی کی انتہا ہوں!

اس سرائے فانی پر میرا جھنڈا لہراتا ہے۔

انسان کی ظفر مندی کا میں نشان ہوں۔

جب طوفان کی طرح تالی بجاتے ہوئے جھپٹتا ہوں تو زمین و آسمان

میرے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔

دُنیا کی پیٹھ پر میں آگ کا پہاڑ ہوں، شعلہٴ جانکاہ ہوں۔

کہ دے! اے جہاں مرد کہ دے کہ میں سر بلند ہوں۔

میں وہ جنگ کی دیوی ہوں جس کا سرتن سے جُدا ہو گیا تھا۔  
جہنم کی آگ میں ہنا کر جب میں ہنتا ہوں تو میرے مُنہ سے  
بھول جھڑنے لگتے ہیں۔

میں فانی ہوں! میں باقی ہوں! میں ازلی ہوں! میں ابدی ہوں!  
میں وہ وحدت ہوں جو کثرت سے بالاتر ہو۔

میں انسان، شیطان، فرشتہ — سب کے لیے باعثِ خوف ہوں  
دُنیا میں مجھے آج تک شکست نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی۔  
میں خدا ہوں! میں حقیقی معنوں میں مکمل ترین انسان ہوں۔  
بہشت، زمین اور تختِ الشرائع میں رقص کرتا پھرتا ہوں۔  
میں دیوانگی ہوں، وحشت ہوں!

کہ دے! اے جواں مرد کہہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا۔  
میں نے خود کو پہچان لیا۔ میرے سب بندھن کھل گئے۔  
میں 'پرشورام' کی سنگِ دل گھماڑی ہوں۔ دنیا کو خوں ریزیوں  
سے پاک کر دوں گا۔ یہاں میں ہی امن و امان قائم کروں گا۔  
ایک نئی دنیا بسا کر میں اس قدیم سیاہ کہہ کی اینٹ سے  
اینٹ بجا دوں گا۔

میں سخت الشرائع کا مومن ہوں جہاں آگ شور و غوغا  
مچاتی ہوئی دھاڑیں مارا کرتی ہو۔

---

ملہ ہند دیومالا کا ایک قصہ۔ پرشورام برہمن تھے اور کسی بات پر چیتروں  
سے برہم۔ اپنی گھماڑی سے انھوں نے ۲۱ مرتبہ چیتروں قتل عام کیا۔

میں بجلی پر بیٹھ کر کلیں کرتا ہڈا کبھی یہاں اور کبھی وہاں دوڑا  
پھرتا ہوں!

میں زلزلہ پیدا کر کے دنیا کو لرزہ بر اندام کر دیتا ہوں!  
کشن کی کلفنی اور جبرئیل کے نورانی عصا کو میں نے پھین لیا ہے۔  
میں دیوتاؤں کی اولاد ہوں۔

میں مضطرب ہوں۔ میں گستاخ ہوں۔ مادرِ عالم کا آپٹل اپنے  
دانتوں سے تار تار کر ڈالتا ہوں۔

میں شیام کے ہاتھوں کی منی ہوں۔ میری جادو بھری تان سے  
متوالا ہو کر سمندر گرج گرج کر آتا ہے اور سہمی ہوئی دنیا کو بوسہ  
دے کر سلا دیتا ہے۔

جب میں بگڑ کر اٹھتا ہوں تو آسمان کو ہلا دیتا ہوں دوزخ  
بھی تھر تھر کا پنے لگتی ہے۔

میں ساون کے پھینے کی ڈبڈبائی ہوئی ندی ہوں۔ کبھی زمین کو  
شاداب بنا دیتا ہوں تو کبھی برباد۔

شہابِ ثاقب ہوں، مریخ ہوں، دم دار ستارہ، زہریلے ناگ  
کا من ہوں۔

کہ دے! ای جواں مرد کہ دے کہ میں ہمیشہ سر بلند رہوں گا  
میں باغیوں کا سردار ہوں۔

خون خواری سے میرا جی بھر گیا ہے۔

میں اسی دن مطمئن ہوں گا جب مظلوموں کی فریاد فضا سے  
آسانی میں نہ گونجے گی۔

جب میدانِ جنگ میں تلوار اور خنجر کے خوفناک ترانے نہ سنائی  
 دیں گے، وہ باغی جو جنگ و جدل سے نالاں ہو اسی روز خاموش ہوگا  
 میں وہ باغی ”بھگتو“ ہوں جس نے بھگوان کے دل پر اپنا  
 نقشِ قدم ثبت کر دیا تھا۔

جو خیالی قسمت سارے ظلم و ستم کی بڑھی، میں اس کی  
 بوند بوند پی جاؤں گا۔

میں وہ باغی ہوں جو قسمت کے ظلم کو توڑ سکتا ہوں۔  
 میں ہوں ازلی اور غیر فانی باغی۔

دنیا کو ٹھکرا کر ایک بار پھر میں تن تنہا سر اٹھا کر اٹھ کھڑا ہوا ہوں



لے ہندو دیومالا کا ایک قصہ۔ ایک مرتبہ دشمن بھگوان آرام فرما رہے تھے کہ  
 نگاہاں برہاجی کا سرکش بیٹا ”بھگتو“ وارد ہوا۔ اور ان کے سینے پر ایک  
 ٹھوکر بڑی۔

# طوفان آگیا!!

طوفان آگیا! طوفان آگیا!!

وہ دیکھ کر دکھتی ہر مٹی بجلی اس کی آمد کا پیام دے رہی ہے۔  
 اٹھ! او بزدل، اب بھی اٹھ، کہ اُس کی کرکٹ سے بند دروازے  
 کے پر نچے بل بھر میں اڑ جائیں گے۔  
 یہ دیکھو مغرب کی جھال میں کالے کالے بادل طوفان کا پرچم  
 لہرا رہے ہیں۔

اس کی ٹیڑھی چٹوٹ کے اشاروں پر تندی نالوں کی موجیں  
 سج و تاب کھا رہی ہیں۔

دیکھ اس کی تلوار کا مار کھا کر برقی تپاں کس طرح ترپتی ہے  
 سنبھل جا ورنہ تیرے اولہام کی دنیا کو وہ ابھی ابھی درہم برہم  
 کر دے گا۔

پھر خواہ نسیم شبنم کے آنسو ٹپکائے، خواہ گلبن میں پھول برسیں اور  
 بادلوں کی آنکھیں اشک نشاں ہوں۔  
 مگر اُن کی آڑ سے روزِ حشر کی دُزدیدہ آنکھیں تاکنے لگیں گی۔

جس دلیں میں سورج ڈوبا کرتا تھا، آج وہیں آفتاب ہمیشہ  
 جگمگا رہا ہے۔

موتوں تک اپنے خون اور پسینہ سے سینچ سینچ کر جس خاک کو

ہم نے کیا بنایا تھا، جس زمین میں ہم نے بھول کھلائے تھے،  
 جہاں ہم نے بریت کے گیت گائے تھے۔  
 آہ! آج اسی گلستاں پر ہمارا کوئی اختیار نہیں۔  
 آہ! آج اپنے گھر پر ہمارا کوئی بس نہیں۔

شام کے پھیکے پن میں جب شوق کے ترانے گاتے ہوئے  
 بلبل اپنے آشیانے کی طرف بڑھا تو کیا دیکھا کہ کانڈھے پر خون آشام  
 ناوک بے صیاد اُسے لچھائی ہوئی نظروں سے تک رہا ہے۔  
 اب بے کس بلبل خرمن میں کس طرح جائے کہ اوپر شاہین  
 پر تول رہا ہے اور نیچے ناوک فگن تاک لگائے ہوئے تھے۔

یہاں طوفان آگیا۔ طوفان آگیا یا قیامت کا پیغام آگیا۔  
 آج زندگی کی بازی لگا کر موت کے چنگل سے نکلنے کے لیے وہ  
 تیار ہے؟

جو طوفان کے ساتھ نہ چلے گا وہ یقیناً آگ میں جل جائے گا۔  
 آگ میں جل یا دریا میں تیر دونوں میں کوئی فرق نہیں۔  
 جب موت کے ہاتھوں چھٹکارا ممکن نہیں تو اس سے خوشی  
 خوشی گلے کیوں نہ ملیں۔

اس زندگی کو کبھی فنا نہیں۔ یہ بقائے دوام ہے۔  
 اگر زندگی کی طرح جینا ہے تو سر کے اوپر طوفان کا سایہ رہنے  
 دے اور قدموں کے نیچے دریائے موت کو پیچھے دے۔

یہ جسم رحمتِ باری کی دین ہی۔ کیا تو اس کی تحقیر کرتا ہے؟  
 کیا تو کتوں اور گیدڑوں کا کھا جا بننا چاہتا ہے؟  
 اونا دان! زندگی پھولوں کا ہا رہی موت کے گلے میں ڈالنے کے لیے

میں اس وسیع دنیا کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوں اور لاتعداد  
 ستارے مجھے راہ دکھاتے ہیں۔

میری زیارت کو چاند اور ستارے باری باری سے آتے ہیں  
 نیلا آسمان میری بارگاہ کا شامیاء ہی اور عندلیب میرے درپر نوبت  
 بجاتا ہے۔ برسات میں بادل میرا غل تیار کرتا ہے۔

اکی بزدل! ان نعمتوں کا صلہ دینے سے تو کس طرح انکار کر سکتا ہے؟  
 ہم تو موت کے ہاتھوں بک کر قدرت کے اس قرض سے بیباک ہو جائیں گے  
 یہ جسم پاک اس لیے نہیں کہ امراض سے ہلاک ہو، ہم تو اسے قربان گاہ  
 پر چڑھا دیں گے۔

یہ جسم کتنا حسین ہے، کس قدر خوبصورت!  
 ہم اسے کر یہ امراض کے سپرد کیوں کریں؟  
 جسم کے پھول کو زندگی کی آرتی میں رکھ کر موت کے دیوتا کی  
 نذر کیوں نہ کریں؟

ہمان کو مڑھائے ہوئے پھول نہیں دیے جاتے۔  
 جا، زندگی کے پودے سے نو شگفتہ پھولوں کو توڑ لا۔

طوفان آگیا! اس ہمان کی تفہیم کر۔ اسے اپنے گھر میں جگہ دے

دوست کا گھر دیکھ کر یہ ہم دم بے مٹائے آگیا۔  
اس سے بغل گیر ہو۔

زندگی کے پیالے کو جوانی کی شراب سے بھر لے اور اسے پی کر  
بدست ہو جا کہ تجھے طوفان کی ہم رکابی کرنا ہے۔

ناسمجھ! طوفان میں اتنا زور ہے کہ تیرا مکان چشمِ زدن میں بیٹھ  
جائے گا۔ دیوار کا سہارا لیے تو کیوں لرزہ براندام ہو رہا ہے۔

خاموش نہ بیٹھ۔ دروازے کو توڑ دے اور میدان میں آ جا!

---

سورج ڈوب رہا ہے، اندھیرا چھا رہا ہے۔

لیکن اب بھی موقع ہے۔

جی چاہے تو اب بھی نکل آ۔

کہ طوفان آگیا !!!



## ڈوبتا ہوا ملاح

یہ دلدل ڈکھ درد کے پانی سے گھرا ہوا ہے۔  
 او پاگل! تو نے اپنا گھر وندا یہاں کیوں بنا رکھا ہے؟  
 بے باطل کی بجلی کا اشارہ یہ ہے کہ اسی محروم حیات! اپنی بساط بڑھلا۔  
 دیکھ بادلوں کا پانی ماں کے آنسوؤں کی طرح سر پر چمک رہا ہے۔  
 اور دُور سے زمین درختوں کو اپنے بازوؤں کی طرح ہلا کر پاس بلا  
 رہی ہے۔

سرجوش سیلاب میں تیری بیٹیاں مُسکیاں بھر رہی ہیں۔  
 ندی کی گود آن کے بغیر سُنی ہے۔  
 ملاح! ملاح! بادبان کھول دے کیوں کہ یہ بے حقیقت کشتی  
 موجوں کے پھیڑے کھا کھا کر تھرا رہی ہے۔  
 تیری جد و جہد بیکار ہے، اب فنا کا لنگر کھول دے۔  
 تیری جھونپڑی میں جوار بھانٹے کا پانی گھس رہا ہے۔  
 تیرا اٹھپ عمر ساحل کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے۔  
 یہ ہدم دیرینہ بھری برسات اعد اندھیری رات میں تیرا  
 غم گسار تھا۔

لیکن تو ہے کہ اب تک پھٹی ہوئی چٹائی پر لیٹا ہوا ہے۔  
 اس غم و اندوہ کی زنجیر کو ہمیشہ کے لیے توڑ کیوں نہیں دیتا۔  
 تو ہیرے موتی کے خزانوں کی جستجو نہ کرتا تھا۔

اور نہ سیم و زر کی چاہت رکھتا تھا۔  
تو کیا چاہتا تھا؟ — مٹی کا ایک پیالہ، ٹوٹا ہوا دیا، چھوٹی  
سی جھونپڑی اور تھوڑی سی نیند!

بدبخت! یہی تو تیرا مقصدِ حیات تھا۔  
وے! ان نعمتوں کو چرانے کے لیے بیماری، پیری اور موت  
تیرے گھر گھس آئے ہیں۔

مانجھی! تیری ناؤ ڈوب کر زمین کی تہ سے لگ رہی ہے۔  
سنبھل کہ کہیں سخت مٹی کی ٹکر سے تیرے پیر لہو لہان نہ  
ہو جائیں۔

لیکن تو تو ملکِ مدم کا مسافر ہے۔ پھر تجھے کس کا کھٹکا ہے۔  
بادل گھرے ہوئے ہیں، بجلی کرٹک رہی ہے۔ سمندر پچ دتا ہے  
کھا رہا ہے لیکن تجھے ان سب کی کیا پروا ہے۔  
تجھے تو زمین کے اندر جانا ہے۔

## ناخدا

مسافرو! سن رکھو کہ آدھی رات کے وقت فلک یوں پہاڑ  
لق و ذوق صحرا اور ناپیدا کنار سمندر سے بہو کر گزرنا ہے۔

ناؤ ڈمگنا رہی ہے! پانی چڑھ رہا ہے! ناخدا راستے سے

بھٹک رہا ہے! بادبان تار تار ہو گیا ہے!

اس کٹھن گھڑی میں پتوار کون سنبھالے گا؟ ہر کسی میں ہمت؟

مستقبل لٹکار رہا ہے کہ جو بہادر ہیں وہ آگے آئیں یہ آدھی

بڑی بکٹ ہے۔ اس سے جو بھنے کے لیے بڑا جو کھم اٹھانا پڑے گا۔

پھر بھی کشتی کو پار لگانا ہی ہے۔

وطن کے پاس بانو! ہوشیار! خیردار!

رات اندھیری ہے اور ہمارے کارواں کو صدیوں کا

سوز دروں دعوتِ راہ نوردی دے رہا ہے۔

ہمارے دکھے ہوئے دلوں میں چھپی ہوئی آگ بھڑک رہی ہے

اس آگ کی مشعل سے ہمیں اپنی راہ تلاش کرنا ہے۔

بلے بس قوم کا بیڑا منجدھار میں غرق ہو رہا ہے۔

ناخدا! دیکھنا ہے کہ آزادی وطن کے وعدہ کو کس حد تک

نباہتا ہے۔

کون پوچھتا ہے کہ ہندو کون ہے اور مسلمان کون ہے؟

ناخدا کہہ دے کہ جو انسان غرق ہو رہے ہیں وہ سب

مادر گیتی کی اولاد ہیں۔

پہاڑیوں کے سلسلے، رہبروں کے پست حوصلے، بجلی کے کڑا کے۔

پھر حسرت رفتار ہم راہیوں کے دل خوف سے کیوں نہ  
لزر جائیں۔

ناخدا! کیا تو بھی راہ بھول جائے گا؟ کیا اس ناؤ کو  
منجد صحر میں چھوڑ دے گا؟

ہنیں نہیں، تو اسے طغیانی اور تلاطم سے نکال لے جائے گا  
ناخدا! تیرے سامنے جنگ کے میدان ہیں جن کی سٹی انست  
کے خون سے لالہ گوں ہو گئی ہے۔

لیکن پروا نہ کر۔ ہمارا جو آفتاب اقبال غروب ہو چکا ہے  
وہ ہمارے خون سے ہنا کر پھر ایک بار جگمگائے گا۔  
پھانسی کے تختوں پر چڑھ کر جنموں نے زندگی کے گیت  
سکائے تھے

وہ حسرت سے تیرا منہ تک رہے ہیں۔

تو اُن کے لیے کیا تحفہ لایا ہے؟

ناخدا! آج تیرا امتحان ہے۔ دیکھنا ہے کہ تو کس کی نجات  
کا جو یا ہے۔ اپنی یا انسانیت کا۔

سنجھل! سنجھل! کہ ناؤ ڈمگ رہی ہے۔ پانی چڑھ رہا ہے۔

ناخدا! خبردار! ہوشیار!

## اندھا دیوتا

منزلِ موت کے مسازوں کے لہو لہان نقیض قدم کو دیکھتا  
ہوا وطن کا اندھا دیوتا ادھر آ رہا ہے۔ پھانسی کی رسی ہاتھ میں  
لیے ہوئے!

اس کی جبین پر ایک سیاہ داغ ہے۔ صدیوں کی غلامی کا  
داغ۔

بے نور آسمان، اندھیری رات اور خاموش بادل! صرف  
کہر آلود کہکشاں کے ہاتھ میں ایک مشعل ٹٹما رہی ہے۔  
اور اُن کے بیچ سے ٹکراتا ہوا اندھا دیوتا دھیرے دھیرے  
چلا جا رہا ہے۔

اس کے قدم اسی طرف اُٹھتے ہیں جدھر ہڈیوں کا ساز  
بجتا ہے۔

دشمن جس حربہ سے وار کرتا ہے۔  
اسے سہارے کی کڑھی بنا کر وہ کسی نامعلوم منزل کی  
طرف جا رہا ہے۔

رُک رُک کر سنبھل سنبھل کر اندھا دیوتا آگے بڑھتا ہے اور  
راستہ جتنا بکٹ ہوتا ہے اس کا جوش اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے۔  
وہ لڑکھڑا کر گرنے لگتا ہے تو موت کا ایک نیا جویا آ کر  
اُسے ختم لیتا ہے۔

جس کال کوٹھری کے دروازے پر قیدی اپنی زنجیروں سے  
باتیں کیا کرتا ہے،

پھانسی کا جو تختہ ہمیشہ خون سے نہایا کرتا ہے،  
جس جگہ روح ظلم کے تلووں تلے روندی جاتی ہے،  
جہاں وحشی دندنے اپنے ناخون تیز کیا کرتے ہیں،  
جہاں قربانی کے جانور چیتے ہیں اور زندہ عورتیں آگ میں

جلتی ہیں

دہیں۔ ہاں وہیں سے ہو کر اندھے دیوتا کا راستہ گزرتا ہے۔  
وہ پکارے جاتا ہے: ”یہ لو پو بھٹ چلی، ارے نیند کے ماتو کچھ  
ہوش ہے؟ دکھیو شفقی نمودار ہو گئی۔“

لیکن ابھی اندھیرا باقی ہے اور رہرو کسی انجان سمت کی طرف  
بھاگے جا رہے ہیں۔

وہ نہیں جانتے کہ دیوتانے کہاں سے آواز دی ہے۔  
وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ کوہِ نذا سے ایک صدا آئی ہے۔  
قدم آپ اپنی رفتار کی چاہ میں باولے ہو رہے ہیں۔  
سامنے راستہ، اوپر دیوتا۔ پھر منزل کی خبر کون لے۔  
راہ میں دلدل ہے یا کھائی۔ یہ دیکھنے کی فرصت کسے ہے۔  
مسافر چل رہے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ راستہ بھی  
بھاگ رہا ہے۔

موت، شباب، اندھا دیوتا اور شفقی کا تبسم۔

یہ سب ہم دم اور ہم سفر ہیں! -

## طائر صبح

ارے او طائر صبح

جل آج سے میں بھی تیرا ہم نوا اور ہم سفر ہوں۔

لے اپنی نبی میں میں تیرے معصوم نغموں کو سموتا ہوں اور

تیرے سر میں اپنا سر پروتا ہوں۔

صبح و شام تُو جو گیت گاتا ہے، وہ ایک بے نشان دیس کی طرف

پرداز کناں ہے۔

اُس گیت کی گونج ہر دم رواں دواں ندی کی لہروں کے

من کی ہوک بن گئی ہے۔

سُن لے کہ میں اُن کی گت کو اپنے پیروں کا گھنکر فیناتا ہوں

اور اُن کے تال پر میری نظموں کی بحر متوالی ہرنی کی طرح

رقص کرتی ہے۔

تو جو بھی نغمہ چھڑے گا

اسی کے سرگم پر میری شاعری کی برکھا برے گی۔

تیری جس پکار کو سُن کر رات کے وقت بن باسی دہل جاتے

ہیں

جسے سُن کر شفق سورج کو گود میں لیے ہوئے صبح کے دیچوں

سے جھانکنے لگتی ہے

اور گائے اپنے چردا ہے کو جگانے کے لیے گلے کی گھنٹی

بجانے لگتی ہے

اسے دیوانے میں تیری اس لڑکوسیکھ آیا ہوں۔

تیرے بازوؤں کی رفعت

جن کا اشارہ دن کو آجاتا ہے اور منہ بند کلیوں کو کھیلتا ہے

اور جسے دیکھ کر نحیف اور ضعیف اندھیرا تنہائی کی راہ

بھاگتا ہے۔

مجھے اس رفعت سے آنکھ ملانے کا موقع ملا ہے۔

اب میں بھی بلندیوں پر غزل خواں ہوں گا

اور میرے اذن پر نیچے بہت نیچے چمپا کی بیل سجدہ ریز

ہو جائے گی۔

طارُ صبح! یاد ہے کہ میں نے بھی ایک لمحہ کے لیے تیرے

آشیانے میں بسیرا کیا تھا۔

شباب! او شباب!

تیرے جوان لغنوں کی تھر تھراہٹ سے میرا ”دل رُبا“ خود

بخود بیچ اٹھتا ہے۔

تیری آنکھوں کی جوت تاریکی کے جگر میں عکس نلگن ہوتی ہے

اور سورج کی جبین سے شام کے دُھندلکے کا داغ دھوٹی ہے

تیری دی ہوئی جس صنیا سے مندروں کے چراغ جلا

کرتے ہیں

اور جس کی ایک کرن منجدھار میں پڑی ہوئی کشتی کو

راہ دکھاتی ہے

میری بے بصر آنکھیں اسی کے نور سے روشن  
 ہیں۔  
 دیکھو ! دیکھو کہ میرا تخیل حُسن کی دنیا بنانے  
 نکلا ہے۔



## صنورِ اسرافیل

تم سب انقلاب کے نعرے بلند کرو، تم سب بغاوت کے گیت گاؤ۔

دیکھو طوفان اور آندھیوں میں بھی سرنگوں نہ ہو کر وہ دور جدید کا پرچم لہا رہا ہے۔

قیامت کے نشے میں متوالا ہو کر تباہی و بربادی کو اشاروں پر پختا ہوا وہ وحشی آ پہنچا اور اُس نے سمندر کے سوتوں پر نشتر لگا دیے۔

اس کے مہیب اور ڈراؤنے چہرے پہ موت تبسم بن گئی۔  
عزرائیل کا محشر انگیز لبادہ اوڑھے اجل سے زیادہ عمیق اندھے کنوؤں سے سر نکال کر مشعل برق روشن کیے جب وہ قہقہہ لگاتا ہے تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت کے گیت گاؤ۔

جب وہ اپنی زلفوں کو بھیلدا دیتا ہے تو اُن میں سے شرفساد کی چنگاریاں نکل کر آسمان میں آگ لگا دیتی ہیں۔  
دُمدار ستارہ کی شرر بارہنگاہیں اس کے لیے مشعلِ راہ بن جاتی ہیں۔

دنیا کے دل و جگر سے خون نکال کر وہ اپنی تلوار کو دھوتا ہے جس کی بے پناہ جھنکار سن کر سب خاکئی و نورئی

دم بخود رہ جاتے ہیں۔

جب وہ فضا کو خاموشی کا سبن پڑھاتا ہو  
تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت  
کے گیت گائو۔

آفتاب سوانیزے پر آکر اپنی تمام گرمی اس کی آتش فگن  
نظروں میں ڈھال دے گا اور اُس کے پریشان بالوں میں  
فریادیں آ آ کر چھپ جائیں گی۔  
سمندر خشک ہو ہو کر اس کی آنکھوں کے آنسو بن جائیں گے  
جب خود زمین اُس کے کاندھوں کا سہارا لے کر شور قیامت  
پر گوش بر آواز ہو جائے گی

تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت  
کے گیت گائو۔

خبردار! ہوشیار! اس بار قیامت برف کی سلیں دنیا  
کے سینہ پر رکھ دے گی۔  
بوڑھوں اور مردوں کے لیے اس ہنگام حشر میں کہیں  
جگہ نہیں۔

کل یہ ہنگام فرو ہو جائے گا تو بنتِ نور بیوہ ہو چکی ہوگی  
اس کے ماتھے کا سیندور، صبح کی لالی غائب ہو چکی ہوگی۔ جلد  
کی کرنیں چنگاریاں بن کر صبر و سکون میں آگ لگا دیں گی۔  
پھر کیوں نہ تم نعرۂ انقلاب بلند کرو، کیوں نہ بغاوت کے  
گیت گائو۔

وہ دیکھو دجال نے اپنا خویش عصا سنبھالا اور قہر و غضب کے دیوتاؤں کو آتش و باد کے کفن پہنادیے۔  
اور لو برق و رعد نے طوفان اور آندھی نے اپنے ترنم سے آسمان کے تاروں کو منتشر کر دیا۔

اسی کی ٹھوکروں سے ستارے ٹکڑا ٹکڑا کر شہابِ ثاقب بن گئے اور آسمان میں شگاف ڈالنے لگے۔

زلزلوں نے کتوں کو یوں اُچھال دیا کہ وہ مینار بن گئے۔  
اور ایسے ہی موقع پر اگر وہ رخشِ فہر پر سوار آجائے تو تم سب کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کرو کیوں نہ بغاوت کے گیت گادو۔

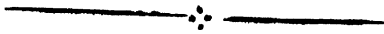
مگر سٹر قیامت سے تو کیوں لرزہ بر اندام ہو رہا ہے؟  
یہ تو ایک نئی دنیا کی آفرینش کا پیغام ہے۔  
وہ زمانہ آرہا ہے جب کہیں کثافت اور نفرت کا نام نہ رہے گا۔

قیامت کی ان بربادیوں کے باوجود جو جیسے باقی رہ جائے گی وہ جمالِ باری ہی جو از سرِ نو حسن و رنگینی کی دُنیا بسائے گا۔

جب ہر شو حسین و رنگین بننے والی ہے  
تو ہم کیوں نہ نعرۂ انقلاب بلند کریں، کیوں نہ بغاوت کے گیت گائیں۔

یہ تو تعمیر و تخریب کا کھیل ہے۔ اس سے خوف و خطر

لا حاصل ہے۔  
 دُلعنوں سے کہہ دو کہ سہاگ کے گیت گائیں، دوغیزاؤں  
 سے کہہ دو کہ چراغ جلا دیں۔ اب دنیائے حُسن تاریکی و تباہی  
 کا لباس پہننے والی ہے۔  
 جب حُسن کی تخلیق بھی بربادی کے ہاتھوں ہوتی ہے  
 تو ہم کیوں نہ نعرہ انقلاب بلند کریں، کیوں نہ بغاوت  
 کے ترانے گائیں۔



## کوئی زنجیر ہلاتا ہی!

دروازے پر طوفان دستک دے رہا ہے۔

اٹھ، ای جاواں مرد اٹھ اور دروازہ کھول۔

مہرتاباں کی شعلہ ساماں اور آتش بیاں زبان لکار رہی  
ہی کہ شباب کا یہ مرحلہ شوقِ حیاتِ دارین حاصل کرے۔

آشفٹہ و وارفتہ بیلے شبِ رخصت ہو رہی ہی اور فضائے  
بیض کی ردا تے سرگمیں میں اس کا دمِ واپس سنائی دے  
رہا ہے۔

لیکن ادھر دیکھ کہ منزلِ شوق کا مسافر تجلی کی مشعلیں  
یے اُفق پر نمودار ہو رہا ہے۔ نیند کے جاگے مُرغانِ چمن اُس  
کے خیر مقدم کے گیت گارہے ہیں اور ہوا کے جھونکے خوشی کے  
بوجھ سے دب رہے ہیں۔

آسمان پر بجلی کے کڑا کے ٹوٹا بجا رہے ہیں، آندھی سوکھی  
پتیوں کے گھٹنگر و پہنے خوشی کے نشے میں چوڑا لڑکھڑا رہی ہے۔  
غم کے آنسو اور ظلم کے خون میں ہنسا کر وہ جمیل و شکیل  
ادھر آ رہا ہے۔

تابستان کے بائیں ہاتھ میں اس کا خاک آلود پرچم

لہرا رہا ہے۔

اور اس کا چہرہ زخموں کے مارے لہو لہان ہو گیا ہے۔

کوئی زنجیر ہلاتا ہے

اوشیاب! اور پیغمبرِ جدید! کیا تو میرے دکھِ درپن میں  
اپنا منہ دیکھ رہا ہے؟  
کتنے اشکِ جم جم کر آنسو بنے ہوں گے۔ تب کہیں تیری  
تلوار تیار ہوئی ہوگی۔

اوشیاب! تیری دُور افتادہ منزل کو میرے نغمے آسان  
اور گوارا بنا رہے ہیں اور میں تیرے مستقبل کے خد و خال  
تیار کر رہا ہوں۔

میرے گونجنے اور گرجنے ہونے گیتِ صبح و مساتیرِ آمد  
آمد کا ترانہ سُنانے ہیں اور میری آوازِ صویرِ اسرافیل کی طرح  
تیری کامرانی کا پیام سناتی ہے۔

میرا پیام اہلِ دل میں ہیجان و اضطراب کی آگ بھڑکاتا  
ہے۔ اور میں تن تنہا تیرا علم بردار بن کر تاریکی میں اُمید کی ضیا  
بھیلا رہا ہوں۔

شب بیدار نشانِ بردارِ پکارِ پکار کر کہہ رہا ہے کہ کاروانِ  
شباب کے سورماؤ! خوب سے جاگو آنکھیں مل ڈالو۔ جاگو جاگو کہ  
طوفانِ دروازے کی زنجیر ہلا رہا ہے۔

دیکھو دیکھو کہ انقلاب کا دیوتا تمہارے سر ہانے آکھڑا  
ہوا ہے۔

یہ دیوتا ہر زمانے میں آتا ہے اور ایک نئے دور کا سندھیہ  
لاتا ہے۔

وہ بار بار اذن دیتا ہے۔ در در جا کر پکارتا ہی لیکن تم پھر بھی بیدار نہیں ہوتے اور بربط کے تار تھک کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ آٹھ کار، دیوتا مایوس ہو کر واپس چلا جاتا ہی اور تمہاری تواضع کے پے گھناؤنے بڑھاپے اور مکروہ موت کو چھوڑ جاتا ہی لیکن اگر اس بار وہ دیوتا دروازے توڑ کر اور ندی، پہاڑ، جنگلوں سے گزر کر تمہیں دعوتِ ہم رکابی دینے آئے تو او پجاریو! اللہ اس کے ساتھ ہو لینا۔

بار بار جس کی خود داری کو تم نے مجروح کیا ہی بار بار جس کے مندر کے دیے تم نے بجھا دیے ہیں، اب اس کی صدا پر لبیک کہنا ہی ہوگا۔

اپنے آپ کو مسوس کر قربانی کی جو ڈال تم نے سجائی ہو آج اسے ہم خونیں دیوتا کی بھینٹ چڑھائیں گے۔ ہم جیتیں یا ہاریں، لیکن اس مرتبہ سر بلند ہو کر یہ کہہ سکیں گے کہ ہم نے تیرے علم کو فلک کے مینار سے باندھ دیا ہے۔ ہم نے تیرے حکم پر سر تسلیم خم کیا ہی اور قربانی کی راہ میں اپنے کو مٹا دیا ہے۔

ہم تیرے قدموں کے تلے اس شان سے کھڑے ہوئے ہیں کہ آسمان کو سر پر اور ستاروں کو پیشانی پر اٹھا لیا ہے۔ اور رہنا! ہم تیری خاکِ پا کو آنکھوں کا سُرمہ بنا کر اسی رستے پر چل رہے ہیں، تیرا ہی نثار ہماری آنکھوں کی جوت ہے۔

آخری شب چور رستے سے دشمن کے سپاہی ایک بیک نکلے  
 اور ہم پر بشنون مارا۔ انہوں نے تیری تجلی کی رہ گرز کو تاریک  
 کر دیا ہو۔ دشمن افتر کے پتھروں کا پہاڑ کھڑا کر رہا ہو اور قدم  
 قدم پر فریب کے کانٹے بچھا رہا ہو۔

اس کے چہرے پر رعونت کی سیاہی پھیلی ہوئی ہو اور وہ  
 فتنہ و فساد کے نعروں سے زمین و آسمان میں لرزہ ڈال رہا ہو۔  
 اور شمس گہر ریزہ! وہ پھونکوں سے تیرے چراغ کو بجھانا  
 چاہتا ہو۔

اے خالقِ جدید! تیرے اشارے پر کس عزم و استقلال  
 سے اسی راہ پر چل رہا ہوں۔

ہر مرکز کاوٹ اور ہر پابندی کو توڑ کر میں اپنی منزل کی طرف  
 بیک رہا ہوں۔

میں کسی الہام کا قائل نہیں۔ کسی مذہبی کتاب کو میں نے  
 اپنا ہادی نہیں بنایا۔

فقط تیری آواز کو میں نے سنا ہو اور اُس کے آگے  
 سر جھکا دیا ہو۔ جب جب تو نے مجھے مپکارا ہو، تجھے یہی جواب  
 ملا ہو کہ ہاں ہاں میں ثابت قدم ہوں، میں اٹل ہوں، میں  
 اچل ہوں۔

جب جب دشمن نے تیرے آئینہ جبین پر کلنگ کا ٹیکہ  
 لگایا ہو، میں نے اپنے خون سے اسے دھو ڈالا ہو۔

اس مایا نندی کو ہم کب پار کریں گے؟ فریب و دجل کے  
اس ریگستان سے ہم کب نکلیں گے؟ کب ہم صداقت و راحت  
کے ساحل کو دیکھ سکیں گے؟

ناخداۓ انقلاب، معیودِ شباب!

کچھ تجھے بھی اس کا حال معلوم ہو؟

او برق گفتار! اس شہرِ خموشاں میں آ اور ہمیں زندگی  
کے سبق پڑھا۔

ہمیں امید کی روشنی دے، اعتماد کی طاقت دے۔ زندگی  
کے اس دلس میں، اس دم گھوٹنے والے قید خانے میں ہمیں  
راحت کی دو چار گھڑیاں عطا کر۔

---

دیکھو دیکھو، ستارے جھوم جھوم کر گما رہے ہیں  
”مردہ باد پیری، زندہ باد جوانی“

دیکھو دیکھو، چاند کی کرنوں پر یہ ساز سنائی دے رہا ہے۔  
حیات و حسن کے پیامبر! تو جگ جگ بیجے۔

تباہی اور بربادی کے پاسبان! تیری موت سر پر  
کھڑی ہے۔

## شامِ وطن

صدہا سال گزر گئے  
اور لیلیٰ شبِ اب تک مشرق کی دہلیز پر آنکھیں لگائے  
بیٹھی ہوئی ہے۔

ندامت کے رنگ میں شہرِ بھر ہو کر قسمت کا ستارہ ڈوب گیا  
اور ہم ہیں کہ اب تک اس خفت کا داغ نہ دھو سکے ہمارا  
خونِ پی پی کر موت زندہ ہے۔

اور اس طریقے سے ہم اپنے اجداد کا قرض ادا کر رہے ہیں  
بھارت ماتا! تجھے معلوم ہے کہ صبح صادق کا منہ ہم کب  
دیکھیں گے؟

جس ہماری ہوئی بازی کی شرم کے مارے شامِ وطن کا  
چراغ بج گیا۔

لا ریب کہ ہم صدیوں سے اس کی لو کو اُکسا رہے ہیں جب  
ہماری جبین کا لہو کا ٹیکا شفق کو لالہ گوں بنانا ہے تو زمانہ اُسے  
دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہے کہ اسی لودہ صبح ہو چلی۔

لیکن اُمید کی جو نوید ہم خونِ جگر سے لکھتے ہیں اُسے قسمت  
کے جابر ہاتھ فوراً مٹا دیتے ہیں۔

کیا یہ شام کبھی نہ کٹے گی؟

ایک نسل کی سیاہ کاریوں کا بار اور کتنی نسلیں اُٹھاتی

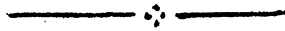
رہیں گی ؟

ان گنت ہاتھ بے شمار دلوں کے سپارے پوجا میں چڑھانے  
لائے ہیں۔

مادرِ وطن، جاگ جا اور اس نذر کو قبول کر۔

اگر ہمارے گناہوں کی کوئی تلافی نہیں، اگر ہماری شام کی  
کوئی صبح نہیں تو اللہ اٹھ اور ہم سب کو فنا کر دے۔

ہمیں زندگی کی زندگی اور بے حیائی کی موت گوارا نہیں۔  
مرنا ہی تو ہم دیوتاؤں کی طرح کیوں نہ مریں۔



## جوانی اور پیری

جوانی کے اُمنڈتے ہوئے دریا کو کیا تو بالو کی دیواروں  
سے روک لے گا؟

جب آسمان پر بدر منیر روونا ہو رہا ہے تو سمندر کے جوار کا  
احاطہ کون کر سکتا ہے؟

چاند اُن کے لیے نکلا ہے جنہوں نے منجھار میں ناؤ بہا دی ہے  
نہ کہ اُن کے لیے جو گندی نالیوں اور تنگ اور تاریک کٹھنوں میں  
مینڈکوں کے ساتھ پڑے اپنی قسمت کو سراہ رہے ہیں۔

دریائے زندگی کا سیلاب جب قدامت اور رجعت کے گھاؤں  
کو تہس نہس کر دیتا ہے تو شاخ پیری پر بیٹھ کر ایک پر شکستہ کوا اُسے  
کو سننے لگتا ہے۔

لبِ دریا کی اس کائیں کائیں پر کان نہ دے کر شاہین  
اُن لہروں کا ہم رکاب ہوجاتا ہے جو ساحل کی قید سے آزاد ہو کر  
ہر طرف بربادی کی نیلی چادر بچھا دیتی ہیں۔

\* \* \* \* \*

رواں دواں دریا کے کنارے، غلاظت اور کچھڑ میں، گدھ  
اور کوسے شرمی ہوئی لاشوں کی تاک میں بیٹھ جاتے ہیں۔

موت اور وبا کے ہم نفس یہی ہیں۔

مگر او بلبل ہزار داستان! — او مؤذن فجر! سیمان کی

غضب ناک نگاہوں سے گہرا کر تو طلوع زندگی کے گیت گانا  
چھوڑ دے گا؟

یہ تو بُزدلی اور منافقت کے بندے ہیں۔  
قسمت کے ستری اور مکرو دجل کے دلال ہیں۔  
درحقیقت کافر و لمدیہی ہیں کہ انسانیت کے خون ٹی بوند بوند  
پی ڈالتے ہیں۔

\* \* \* \* \*

تم سب شباب سے بغل گیر ہو جاؤ۔ غیر فانی جوانی کا بانی اس  
زمین پر ایک روئے نیل گوں بچھا دے گا۔  
موت کے جو جراثیم توہمات کی چہار دیواری میں جینے کے  
عادی ہیں۔

انہیں کیا معلوم کہ یہ جھرنا بحر حیات کی تلاش میں کس

طرف بہا جا رہا ہے۔

جو چمگا دڑم لکھیں بند کبے کسی تاریک حجرے میں پڑھی رہتی ہے  
اسے شفق کی لالہ کاری سے کیا مطلب؟

\* \* \* \* \*

سورج کی کرنوں سے چندھیا کر درخت کے تنے سے سر نکال کر

اگر اندھا سانپ پھنکریں مارنا ہے تو میرے گیت مور کی لٹکار

بن کر اُس کے پیسے پیام موت ہو جائیں گے۔

جن کی زندگی میں اندھیرا ہے، وہ اگر نغیر صبح سے برہم ہو کر بستر

مرگ پر پڑے پڑے گایاں دیں تو تو ان کے ہذیان پر

کان نہ دے۔

ان کے لیے زمانہ اپنے ہاتھوں سے قبر کھود رہا ہے۔ تو اپنے پاک آپ زندگی کو ان بردلوں کی لاشوں سے ناپاک نہ کر۔  
اسیرینا جھوٹے ٹکڑے کھا کر پنجرے میں بیٹھی سکھائے ہوئے گیت گا رہی ہے۔

او آزاد پیسے! فضائے آسمانی کو اپنے ظلم شکن نعروں سے تھر تھرا دے!

تو عرش کی بلندیوں پر رہتا ہے، ان گبریلوں کی پروا نہ کر۔  
مٹی کے تیل کا دھندلا چراغ چاندنی کو بے نور نہیں کر سکتا۔  
یہ تو آبِ جو کی سطح پر لٹنے والے جنگلی درندے ہیں جن کا کام ہی چھینٹیں اڑانا ہے۔

تو سر بلند کنول کا پھول ہے جو ہمیشہ اپنی نگہبیتِ عنبریں سے ہوا کو جانفزا کرتا رہے گا۔

\* \* \* \* \*

تیرے شفاف جسم میں وہ اپنے بدن کا میل لگانا چاہتا ہے۔  
تو آزرہ نہ ہو کہ جس کے پاس جو ہے وہی تو دے گا۔  
درخت اپنی شاخوں کو پھیل اور پھول سے سجاتا اور پرندوں کو زمرہ پر داز کرتا ہے۔

اگر کوئی دو پایہ کٹھاڑی چلائے تو اس سے درخت کی توہن تو نہ ہوگی۔

اگر پھولوں کو توچ کر بندر خوش ہوتے ہیں تو کیا باغبان تو

درد سے چیخ اٹھتا ہے

شباب! پھر تو بڑھاپے کے کوسنوں سے کیوں چڑھتا ہے؟

اس کا جنازہ توکل ہی نکلنے والا ہے

جس دشت میں تو آبادیاں بسائے گا، اگر اس کے کانٹے

بچھے چھیرتے ہیں تو ہر سیاں نہ ہو کہ ایک جنبشِ پاسے تو انھیں روند

سکتا ہے۔

مغرور جوانی ہر زمانے میں حکمراں رہتی ہے۔

وہ نہ کبھی بڑھاپے کے آگے سرنگوں ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔

x x x x x x x x x

ہم ایک نئی دنیا بنائیں گے۔ ہم ایک نیا نغمہ چھڑیں گے۔

اور یہ زمین ادب سے جھٹک کر ہمارا تحفہ قبول کرے گی۔

ہم نوجوان ہر زمانے میں بوڑھوں کو قبر میں اتارنے آئے ہیں

اگر وہ گالیاں دیں تو ہمیں مہنس کر کہنا چاہیے۔

” انا للہ وانا الیہ راجعون“

## بیداری کا راگ

جو جاگتے ہوئے بھی غفلت کی چادر اوڑھے پڑے ہیں ارے  
 نادان، ان کے دروازے پر تو کب تک دستک دیتا رہے گا؟  
 جو لوگ محلی لمافوں میں لپٹے پڑے ہیں،  
 ان کے لیے زندگی ایک طویل رات ہے۔ وہ ہمیشہ نیند کے  
 ماتے رہیں گے۔

اور تیری آواز انہیں کبھی نہ جگا سکے گی۔  
 جنہوں نے طوفان سے بچنے کے لیے ساحل پر مکان بنالیا  
 اب اُن کا شانہ ہلانا لا حاصل ہے۔  
 جس نے گھر کے اندر گھس کر دروازے کے ارگل کو سختی سے  
 بند کر دیا۔

اس سے کیوں التجا کریں کہ دم بھر کے لیے کواڑ کھول دو۔  
 مسافر! اس راہ کو بھول جا۔  
 سپنا پوری میں بیداری کی شہنائی کو کون مٹے گا؟  
 لیکن اس موت کی خاموشی کو توڑ کر کبھی کبھی ایک فریاد بھی  
 سُنا سکتی دیتی ہے۔

یہ اس کا شیون ہے جسے ہلاکت کی افیون کھلائی گئی ہے۔ تاکہ  
 وہ ہمیشہ سوتا رہے۔

مغنی! اسے جگانے کے لیے تو نیا ساز اُٹھا اور نئے انداز سے

وہ نئے میں ہو اور اُسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں پڑا ہوا ہے۔  
اسے کیا خبر کہ کوئی اس کے جگر کا خون بوند بوند کر کے پی  
رہا ہے۔

دور جدید کے نقیب! تو اس کے دل میں اپنا جادو جگا کیوں  
تیرے راگ کو ایک یہی خفتہ نصیب سمجھ سکتا ہے۔  
اُن دُستیوں کا دل ایک رنگیناں ہو جس میں نہ پھول ہو نہ پانی  
لیکن وہ گدیوں پر بیٹھے دنیا کی نعمتیں چٹ کر جاتے ہیں۔  
یہ کیوں ہو کہ جنہوں نے درندوں کو نکال کر بڑے بڑے  
نگر بسائے۔

وہ خود انسان بنا حیوانوں کے خوف سے موریوں میں سڑا کریں  
یہ کیوں ہو کہ یہ خوشخوار درندے انسانوں کا ہروپ لے کر  
تہذیب کے ٹھیکے دار بن بیٹھیں۔

ظالم وہ ہے لقمہ وہ ہے جو انسان کا خون پیتا ہے پھر تو ان  
الذریعہ تم گروں کے خلاف کیوں نہیں اٹھ کھڑا ہوتا۔  
ہزاروں سال سے استبداد کا درخت پھل پھول رہا تھا۔  
آج اُس کی جڑ کٹنے کا وقت آ گیا۔  
نئی دنیا کے شاعر! پھر کیا دیر ہے۔  
پھیر دے وہ ساز جو حقیر مٹی کے ذروں کو عرش برس سے  
ٹکرا دے!

## افلاس سے خطاب

ای افلاس! تو نے ہی مجھے یہ عظمت بخشی ہے۔  
 عیسیٰ کے سر پر کانٹوں کا تاج کتنا بھلا معلوم ہوتا تھا۔  
 مہربا کہ اسی زمین سے تو نے مجھے بھی سرفراز کیا اور وہ جہاں مودی  
 عطا کی جو ثورِ حقیقی کی پروردہ ہے۔  
 میری نگاہ کو تو نے آتش مگن اور میری زبان کو شند خُو بنایا۔  
 اور یہ تیری ہی تربیت کا اثر ہے کہ میرا نغمہ اُپی تلوار سے زیادہ  
 تیکھا ہو گیا۔

\* \* \* \* \*

مگر ای ستم گر! تیری قیامت خیز تیش نے میرے گنڈن جیسے  
 جسم کو گلا ڈالا۔

بتلا بتلا وہ جمالِ جاں آفریں کیا ہوا؟  
 ان لاغر ہاتھوں تک ابھی مد کا پیالہ آیا بھی نہ تھا کہ اولیٰم!  
 تو نے کس بے دردی سے اُسے چور چور کر ڈالا۔

وہ فردوس بریں اب میرے لیے ایک طلسم خیال ہے اور بس!  
 اب تو میری آنکھیں میرے ہی گھر بار پہ آگ برساتی ہیں۔

\* \* \* \* \*

میری آرزو ایک کھلی مٹی جو درد کی شاخ میں جمول رہی تھی  
 ظالم ابھی وہ کھلنے نہ پائی مٹی کہ تو نے بھوک کی گھبھاری سے

اسے شاخ سمیت کاٹ ڈالا۔

کڑکڑاتے جاڑوں کی صبح کی طرح میرا دل لرزتا تھا۔

جیسے اُس سے بھیگی ہوئی زمین کو بارِ زہریلے بوسہ دے رہی ہو

شبنم کی بوند میں درد کا دریا تیر رہا تھا۔

آہ، تو نے دھوپ بن کر اسے خشک کر دیا۔

راحت و آرام کی سہنا پوری اُجڑ گئی۔

میرے حلق میں کچھ کا گھونٹ ڈال کر تو پوچھتا ہے ”آبِ

حیات میں کیا رکھا ہے۔ نہ سرور ہے اور نہ خار“۔

بدبخت! اس دکھیاری دنیا میں جینا تیرے بس کی چیز نہیں!

تو نے افلاس کی گود میں پرورش پائی ہے۔

کانٹوں کے کینچ میں میٹھ کر آنسوؤں کے ہار گوندھا کر۔

درد تیری کتابِ زندگی کا عنوان ہے۔

اس حد تک فریاد کر اور مصروفِ شکوہ سنجی رہ کہ تیری قوت

گویائی ختم ہو جائے۔

ای غیظ و غضب کی صورت! کشکولِ گدائی لے کر در در کی

ٹھوکریں کھا۔

جہاں عاشقوں کے لیے یہی ’شبِ مسرت‘ کا پیغام لے کر

آئی ہو وہاں جا کر دستک دے اور کہ: ”یہ دنیا عیشِ کدہ نہیں ہے

یہ جہاں اس لیے ہے کہ فراق میں تڑپو اور جدائی کے صدمے

جھیلو۔ محبوب کی آغوشِ کانٹوں کی سیج ہے اسی پر لوٹتے رہو“

یہ سن کر ایک آن میں ماس رنگ کی وہ محفل اُجڑ جاتی ہے۔

اور شمع یہ کہہ کر دم توڑ دیتی ہے کہ موت کی یہ رات کاٹے  
 نہیں کشتی۔

بھوک کا مارا نحیف و لاغر جسم آنکھوں سے اشکارے برسائے  
 لگتا ہے۔

ہر طرف سے قحط اور وبا کے قہقہے سُنائی پڑتے ہیں۔  
 گھٹاؤں میں خزاں آجاتی ہے اور محلوں کا نام دلتاں نہیں رہتا

\* \* \* \* \*

افلاس! تیرے آئین میں صرف ایک سزا ہے۔

تباہی اور بس!

تہذیب و تمدن کو تو پیروں تلے روندتا ہے۔

شرم و حیا کے نام سے بھی تو واقف نہیں۔

رقص عریاں تیرا محبوب مشغلہ ہے۔

جو بھی سر بلند ہوا تیرے ایک اشارے پر فنا ہو گیا۔

بہت سے دیوانے تیرا ارشاد بجا لاکر ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ

جاتے ہیں۔

بھوک کے ایندھن سے موت کی آگ کو مسلگا کر تو کتنا مسرور

ہوتا ہے۔

دولت کی دیوی کے تاج کو کیسی بے باکی سے تو ٹھکرا دیتا ہے

\* \* \* \* \*

کل صبح آنکھ کھلی تو شہنائی کا جگر سوز تراز سننے میں آیا۔

جیسے کوئی بھولا ہوا آج بھی گھر نہ لوٹا ہو اور شہنائی اسے

رو رو کر جلا رہی ہو۔

دُھن کا دل شہنائی کے سروں کے ساتھ یوں تڑپنے لگا گیا  
پتیم جواب میں دُور سے آیا، آیا کہ رہا ہو۔

سکھی ایتھ بتلا، آنکھیں یوں کیوں پونچھ رہی ہے کہ کاجل بھی  
پہ گیا۔

اور آج صبح بھی اٹھ کر سنا کہ شہنائی آؤ آؤ، کہ کہ رو  
رہی ہے۔

سوگوار پھول بیوہ کے نسیم کی طرح ٹپک پڑا۔  
اللہ اللہ! اس دلِ ناداں کو دیکھنا کہ کتنا بے قرار ہو رہا تھا  
اور آمدِ بہار کے گیت کیسے مزے لے لے کر گا رہا تھا۔  
مگر خود بخود میری آنکھیں کیوں ڈبڈبا گئیں؟  
میں سہم کیوں گیا؟

میرا دامن کوئی زمین کے آپٹل سے بانڈ رہا ہے۔  
شاید یہ میری ننھی بچی ہے۔ میری نختِ جگر!  
آہ! میری بچی جاگ اُٹھی، اُس نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔  
اُسے میں دودھ کی دو بوند بھی نہیں دے سکتا۔  
مجھے خوش ہونے کا کیا حق ہے؟

گویا غربت اس بچی کی صورت میں میرے گھر میں پیدا  
ہوئی ہے۔

اور مجھے افلاس کا نوحہ سُنانے کو مجبور کر رہی ہے۔  
میرے نصیب میں نہ حسن و عشق ہے اور نہ حوی و ساغر۔

مجھے پینے کو زہر ملتا ہے اور کھانے کو غم و یاس۔  
 آج تک وہ شہنامی درد بھرے سروں میں گایا کرتی ہے۔  
 کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں ہے! ”



## میرے نغمے

جنہوں نے کوہ و بیاباں کے دامن میں شاداب فصلیں کھڑی  
کر دی ہیں،

جن کی مضبوط مٹھیاں پھناوڑے چلاتے چلاتے پتھر کی طرح  
سخت ہو گئی ہیں،

سہمی ہوئی زمین جن کے آگے پھولوں کی ڈالی پیش کیا کرتی ہے،  
میں انہیں کے گیت گاتا ہوں۔

حیوانوں اور درمزدوں کی یہ بستی، موت اور بڑھاپے کی یہ دنیا۔  
جن کے جتن سے سدا بہار نکل بن بن گئی،

جنہوں نے محبت کے ترانے ایک نئی لہ میں گائے۔

اور جن کے نعروں کو سن کر یہ کائنات خلا میں چکر لگانے لگی  
میں انہیں کے گیت گاتا ہوں۔

جنہوں نے آن کی آن میں ہزاروں جنتیں بنا کر مسمار کر دیں،  
جن کی زندگی کی روانی کوئی نہیں روک سکا،

جنہوں نے ہالیہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر سورج سے باتیں کیں،  
جنہوں نے سمندروں کو بے آب کر دیا،

نئی دنیا کی تلاش میں جو برفستانوں کو بھان آئے اور ہواؤں

میں تیرنے پھرے،

میں انہیں کے گیت گاتا ہوں!

شباب کا دلولہ بے قید ہے۔ وہ چاند ستاروں میں، جنت اور  
 دوزخ میں، عرش پر اور فرش پر۔ ہر طرف پیامِ زندگی سُنا تا پھرتا ہے۔  
 وہ زندگی کا سودا خریدنے کے لیے موت کے بازار میں جاتا ہے۔  
 اور میدانِ جنگ کے قمارخانوں میں زندگی کا چُجا کھیلتا ہے۔  
 میں جو ایک شاعر بے نوا ہوں، اس کی حمد و ثنا کے سما  
 اور کر ہی کیا سکتا ہوں۔

جو ہر زمانے میں اور ہر دور میں انقلاب کا پرچم لہراتے ہیں،  
 جن کا بے ریز شوقِ زندگی اپنے سکون کے لیے زہر کے پیالوں  
 اور پھانسی کے تختوں کا جو یا رہتا ہے،  
 جو پہاڑی ندیوں کی طرح کسی رُکاوٹ کی پروا نہیں کرتے،  
 جنہیں کم نظر بد دعائیں دیتے ہیں اور کم ظرف بد احساق  
 کہتے ہیں،  
 میں اُن کی چوکھٹ پر سر جھکاتا ہوں اور انہیں کے گیت  
 گاتا ہوں۔



## سارہ تخریب

میں ہر زمانے میں، میں ہر دور میں آتا ہوں،  
ہنگام قیامت کا پیغام لے کر۔  
میں اہرن کا قاصدِ اجل ہوں — میں سارہ تخریب ہوں۔  
میری جبینِ فتنہ ساز صدہا جنموں کی آگ سے روشن ہے۔  
بربادی کے دیوتا کی آہِ آتشیں میرے دل کو سلگا رہی ہے۔  
میں بد دعاؤں کی تلخ کامی اور تباہ کاری ہوں۔  
اور میں وہ آواز تو ہے ہوں جو زبانِ یزداں سے بلند ہوتی  
ہے، اپنی مخلوق کی سیاہ کاریوں کو دیکھ دیکھ کر۔  
بصورتِ صحرا میں دنیا کے جگہ کا داغ بن کر روتا ہوں۔  
میں سراپا بد دعا ہوں۔ آتشِ کام اور جہاں سوز۔  
میں خلا میں بربادی کا پرچم لہراتا پھرتا ہوں۔  
اور عرشِ بریں کی طرت بھی زہر و آتش کے نیر پھینکے نہیں  
جھجکتا۔

گرج اور کرک، دھا کے اور شرارے، پیچ اور چکار۔ وہ  
دیکھو اپنی دُوم کی مشعل سے میں نے دُنیا میں آگ لگادی اور  
جہنم بدوش شہابِ ثاقب کی بارش شروع کر دی۔  
میں کئی بار دنیا کو تہ و بالا کر چکا ہوں اور ابھی ایسی صدہا  
کائناتوں کو فنا کر سکتا ہوں۔

میں وہ بلائے ناگہاں ہوں جو زندگی کی عبارت موت کے  
قلم سے لکھا کرتی ہے۔

زہر میں بھٹی ہوئی آتش سیال میری رگ رگ میں سرایت  
کر چکی ہے۔

اور میں لڑکھراتا، گرتا پڑتا ہوا اس راہِ فنا سے گزر  
رہا ہوں۔

مجھ زند خراباتی کے دہشت ناک گیتوں کے آگے پھردوں کی  
گونج۔

میری آتش نلگن زلفوں میں پیغمبروں کی محشر انگیز بد دعائیں  
جادوئے سامری کو جگایا کرتی ہیں۔

میں ہر زمانے میں، ہر دور میں آتا ہوں  
ہنگامِ قیامت کا پیغام لے کر۔

میں اہرن کا قاصدِ اجل ہوں۔ میں ستارہ تخریب ہوں۔  
میں ہر زمانے کی فریب کاری اور معبود کی ہوشیاری کو خوب  
سمجھتا ہوں۔

قدرت کے نظام و آئین پر میں ٹھوکر مارتا ہوں اور اس  
کے احکام کو پائے استغنا سے روند ڈالتا ہوں۔

میں جانتا ہوں کہ مثیث ایزدی ایک افسانہ ہے۔  
میرا رقص شررِ بناوت اور انقلاب کی آندھیوں کو تندہی  
کا سبق دیتا ہے۔

میری ایک پھونک دوزخ کے کل چراغ گل کر دیتی ہے اور

میں حقارت سے موت کے منہ پر تھوک دیتا ہوں۔ صور اسرافیل  
 بھونک کر میں طبل جنگ میں اُس کی صدائے بازگشت سُنتا ہوں۔  
 اور میری زہریلی سانس سلطنتوں کے لیے طوائف الملوکی  
 بن جاتی ہے۔

میں گویا مرجح کی ایسی تیزی ہوں جس سے بچے تڑپ  
 تڑپ جائیں۔

اور میں قید خانے کی کال کو ٹھریوں میں گندھک اور پٹاس کا  
 دُھنٹا ہوں جو ہر سانس کا دم گھوٹ دے۔  
 آگ پر کیلیجوں کو بھون کر کھانے والے آدم خوروں کی طرح  
 میں مخلوق اور خالق سب کو چبا جاؤں گا۔

جنت کی ساری شراب اور جہنم کی ساری آگ میں ایک  
 جُڑے میں پی لوں گا۔

میں اہرن کا قاصد ہوں۔ ہر زمانے میں ہنگام حشر کا پیام  
 لاتا ہوں۔

میں ستارہ تخریب ہوں۔

میں دھرتی ماتا کی سرکش اولاد ہوں۔

اس قدر سعادت فروش اور وفانا آشنا کہ میں اسے اسی  
 کے آتشِ غم میں بھونک دوں گا۔

اس آگ کو میں تباہی کے چنگھ سے ہوا دوں گا، یہاں  
 تک کہ زمین و آسمان اس میں جل کر خاک سیاہ ہو جائیں گے۔  
 میرے ہاتھوں میں مصائب و آلام کی مشعل روشن ہے!

سُن لو اسی قافی اور ابدی ہستیو! میں اس جہان کے معبود کو  
یہی جلا ڈالوں گا۔

سُن رکھو کہ میں شیطان کا ہم نفس، ہم نوا اور ہم دم ہوں۔  
ایک روز اسی آگ میں خدا کو جلانے کی غرض سے میں معبوم آتش کو  
بنا رہتا ہوں۔

بیک آواز تم سب کہو۔

”تو سراپا بد دعا ہے، تو شیطان ہے، تو مالکِ اہل ہے۔  
نہ تو کسی سے ڈرتا ہے۔ نہ تجھے کوئی مار سکتا ہے۔

تو قیامت کا پیام برستارہ تخریب ہے۔

تو دیوانگی اور وحشت کی روشنی ہے۔

تو دجال ہے، تو قہر و غضب کا دیوتا ہے!“

بجا اور درست!۔ ہاں ہاں۔ میں نقیب قیامت ہوں،

میں ستارہ تخریب ہوں۔

میں آگ کی سیڑھی لگا کر خاۓ خدا پر چڑھ جاتا ہوں اور

گرسنی عرش پر آرام کرتا ہوں۔

لوگ مجھے عزرائیل۔ عزرائیل اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں

خدا کے القاب ۹۹ ہیں اور میرے پورے ایک سو!

میرے بالوں میں برق و رعد ترپتے ہیں، دو باتیں آزاد

ہونے کے لیے بلکتی ہیں۔ قوط باہر نکلنے کو مچلتا ہے۔

میرے خوف سے دُنیا کے تاج داد ہمیشہ لرزہ بر اندام رہتے

ہیں کہ کہیں میں اُن کے نصیبوں پر تباہی کی مہر نہ لگا دوں۔

اس زعم میں متوالا ہو کر جب میں مہتہہ لگاتا ہوں تو اسے دعوتِ عمل سمجھ کر لو اور آندھیاں کروٹ بدلنے لگتی ہیں۔

جب میں آسمان پر نمودار ہو کر پیح و تاب کھانے لگتا ہوں تو میرے سانس کی لپٹ سے خفتہ کوہِ تمّتش نشاں تازہ دم ہو جاتا ہے اور میرے دم کے چابک سے زہریلے سانپ جاگ اٹھتے ہیں۔ جس طرح موت اپنے شکار کی شمعِ زندگانی یک بارگی گل

نہیں کرتی

اُسے آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی اور اُمیدِ ویم کے کھیل میں اُس کی جان کو پاش پاش کر کے سلب کر لیتی ہے۔ بس اُسی طرح میں دن رات خدا کو شکار بنا کر اُس کی زندگی یعنی دنیا کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہوں۔

میں اہرن کا قاصدِ اجل ہوں۔ میں سازہٴ تخریب ہوں۔ میں نقیبِ محشر ہوں۔

ایک بار پھر میں سنے خونین کے نلے میں سرشار ہو رہا ہوں۔

کیوں نہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس بساط کو اُلٹ دوں۔

خوفِ خدا؟ - اونٹنہ - وہ خدا تو میرا کھلوتا ہے۔

میری آگ بھری چٹونیں ہی اسے بے دم کرنے کے لیے

کافی ہیں۔

اُس کی حالت تو اُس بچے کی سی ہے جس کے پالنے کے

اردگردِ ایک ہیبت ناک اژدہا رنگ رہا ہو اور پھنکاریں مار رہا ہو

اور بچہ اُسے تاکتا تاکتا دم بخود رہ گیا ہو۔

اسی طرح تخریب کے وار خدا کی ہستی کو معدوم کر رہے ہیں۔  
 اسی بچے کی طرح اس دکھیاری دنیا کی گود میں خدا ہر اس  
 سے آہ و زاری کر رہا ہے۔

ستارہ تخریب اس سوچ میں ہے کہ پہلے کسی کی روح کو  
 پھونک دے؟۔ خالق کی یا مخلوق کی! —



## پیامِ شباب

میں اس شباب کے گیت سناتا ہوں  
جو آج تلوار لیے ہوئے اس نامعلوم منزل کی طرف روانہ

ہوا ہے۔

جس کی برباد کن تاریخ میں ماضی کے ادراق گم ہو جائیں گے  
جس کی سانسوں کی ہپٹ میں دقیانوسی کتابیں جل جائیں گی  
جو ان عبادت گاہوں کو تاشت و تاراج کرتا چلتا ہے جن  
میں بزدل بوڑھوں نے گناہ و معصیت کا مرکز بنا رکھا ہے۔

جس کی زندگی کی روانی میں رسم و رواج کی چٹائیں پہ جاتی  
ہیں، قدامت کی ہڈیاں چکنا چور ہو جاتی ہیں،  
جو بلا خوف و خطر فریب و تزویر کی کندوں کو تار تار  
کر ڈالتا ہے،

جس کی جرات رندانہ قہمت کی پابندیوں کو ٹھکرا دیتی ہے،  
جو گورِ غریباں کے ان پھولوں کو مسل ڈالتا ہے جن کے ہار  
زندگی آج پہنے ہوئے ہے۔

ہاں میں اسی شباب کے گیت سناتا ہوں۔ میں اُن کے گیت  
گاتا ہوں۔

جو چوگانِ ہستی میں آج سب کے میز رو ہیں۔  
میع تک بھی وہ مسافر ساحل کو نہ پہنچا جس نے اس اندھیری

رات کو تلامحِ خیر دریا میں اپنی ناؤ ڈال دی تھی -  
 اسی دیوانے کی یاد میں میں میں نائے نیم شبی میں مصروف ہوں  
 چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھے ہوئے میں چاہتا ہوں  
 کہ نیند کی صورت میں وہ آجائے -

جہاں نور کا وہ جو یا - منزلِ ناتمام کا وہ مسافر جو رات  
 کی تاریکی میں سما گیا تھا، صبح بھی نہ لوٹا -  
 جس کے خوف سے موت کا فرشتہ ہمیشہ لرزہ بر اندام  
 رہتا ہے -

وہ جو سمندر کی گہرائی میں، آسمان کی وسعت میں،  
 زندگی کے ہیجان میں، فضا کی ہر سمت میں موت سے نبرد آزما  
 رہتا ہے -

وہ جو سمتِ انریٰ میں گوہرِ شبِ چراغ کی تلاش میں  
 جا پہنچتا ہے -

وہ جسے ڈس کر ناگ خود زہر مار ہو جاتے ہیں -  
 وہ جس نے یاد دل کی بیٹیوں کو کنیز بنا رکھا ہے، جو بجلی کو  
 اپنی مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے -

وہ جس کی فرماں برداری طوفان کیا کرتے ہیں -  
 میں اسی کے آستانے پر سر جھکاتا ہوں اور اسی کے گیت  
 گاتا ہوں -

میں اُس کا ثنا خواں ہوں اُس کا حمد گو ہوں  
 پھانسی کی رسی جس کے گلو گیر ہوتی ہے -

جس کے خون سے شفق سُرخِ حاصل کرتی ہے قید خانے میں  
 جس کی خدمت کے لیے آزادی کی دیوی آتی ہے۔  
 میں اسی کے گیت گاتا ہوں۔



دوسرا دور

یادِ آیام



## یاد ایام

میرے محبوب !

تجھے میں نے پہچانا بھی تو کب -

جب میرا مقصدِ حیات صرف یہ رہ گیا ہی کہ دھولی ناگن کی  
طرح اپنی آنکھوں میں خاک جھونک کر دن رات ایک خیز داڑھی  
میں رقص کرتا پھروں -

اور اب محسوس ہوا کہ میں تو تجھے روزِ ازل سے جانتا ہوں -  
تیرے گلے میں مچلتی اور زبان پر سقراتی ہوئی اس راگنی  
کو ان غلافی آنکھوں کو، اس آئینہ جبین کو،  
اس جمالِ جہاں آرا کو، راجِ ہنس کو شرمانے والی اس  
نغزشِ ستارہ کو،

ہر ادا کو میں پہچانتا ہوں، ہاں خوب جانتا ہوں -  
اسی لیے زندگی کے بے آب اور آتشین سرچشہ میں تیرنی  
ہوئی یہ جانِ حزیں سپہم تجھے پکار اٹھتی ہے -  
مری فریاد کی صرف ایک لی ہے - میں تجھے جانتا ہوں، میں  
تجھے پہچانتا ہوں -

نہ تو اقلیمِ محبت کی ملکہ تھی نہ گداگر -  
تو پریمِ مندر کی جوگن اور بچارن تھی اور بس -  
مجھ سنگِ دل پر توجے کس کس طرح عشق کے نقش بناتے تھے -

خود کو جلا کر میرے سید خاتمہ دل میں محبت کی لو بیڑ کائی تھی  
اپنی پوجا کے پھولوں سے اس بے برگ و ثمر پیڑ کو ہرا بھرا  
کر دیا تھا۔

دزدگی کی صبح و شام میں اور حیات و ممات کی اٹھنوں میں  
میں نے تجھے دیکھا ہے۔

مگر تو مجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ ایک اجنبی دلیں میں بٹھے  
بے چارگی و تنہائی کے عالم میں چھوڑ کر تو رخصت ہو چکی ہے۔

جب شفق آفتاب سے محروم آسمان کے خونِ تمنا کو مسایاں  
کرتی ہے

تو میرے آنسو بھولے ہوئے افسانوں کو از سر نو زندہ کرتے ہیں  
وہ دن یاد آتا ہے جب بہار خزاں کی طرت حسرت دیاس  
سے تک رہی تھی اور وہ رنگینیوں میں شرابور مبارک رات میرے  
گھر آئی تھی جب میری آنکھیں تیرے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں ڈوب  
گئی تھیں۔

اس وقت میں جوانی کے در پر ٹھٹکا ہوا کھڑا تھا۔  
ٹرکین کی نیم باز آنکھیں شباب کے لیے چگا رہی تھیں۔  
جوانی کی حرماں نصیبی شفق کی لالی کی طرح اپنا رنگ ریح رہی  
تھی۔ دُور سے آئی ہوئی نغمہ کی صدا میں ڈوب جانے والی ہنسی  
کی طرح جوانی کی سرستوں میں میری معصومیت معدوم ہو رہی تھی  
گم کردہ راہ بادِ سموم کی مانند میں راہ بھٹک کر کس

پردیس میں آپھنسا۔

اب میں ہوں اور وہ اشک ہائے صد آشنا جو کسی غریب الوطن  
کے غم گسار ہوتے ہیں۔

صبح سویرے جب میں نیند سے بیدار ہوا تو تومیری طرف  
دیکھ کر کس دل سوز انداز میں مسکرائی تھی۔

اور اس قسم میں میرے آنسوؤں نے چمک کر پوچھا تھا کہ  
تیرا آشیانہ کہاں ہے؟ کس نے تجھے اسیر بنا رکھا ہے؟  
تیری نگاہیں کتنی نازک تھیں۔ میں تو سمجھا کہ میرے نقدِ فراق  
میں تو ہی سوز و گداز بن کر اتر آئی ہے  
جیسے بادِ بہار کی نفیر سے کلیاں چمک جاتی ہیں اور ہرنیاں  
راہ بھول جاتی ہیں۔

پھر آدھی رات آئی اور تو رخصت ہونے لگی تو میں نے وہ  
ترانہ الاپا جس کے سرگم آنسوؤں میں گندھے ہوئے تھے اور جس میں  
میری بے قراری چل رہی تھی۔ کہ نہیں سکتا کہ ان گیتوں کی  
روشنی میں میں کسے اپنے خاندان میں تلاش کر رہا تھا۔ وہ  
دل جس میں ہمیشہ تاریکی اور دیرانی چھائی رہتی تھی۔

اتنا یاد ہے کہ کبھی نیند سے جاگی ہوئی تیری محذور چشم کے  
گلابی ڈوروں میں میری ہلکیں جھپک رہی تھیں۔

یہ بھی یاد ہے کہ ان پلکوں میں حیرت و مسرت نے نبی پیدا  
کردی تھی گویا یہ دردِ فرقت کی گھلاوٹ تھی۔

جب تو میرے حالِ زار پر ترس کھا کر کانپ اُٹتی تو محسوس

ہوتا کہ لیلائے شب نے کسی کا سوگ لیا ہے۔

جانِ جاں! تیری آنکھوں میں محبت اور ہمدردی نے جو جوت  
جگامی تھی اس میں میری پاسی آنکھیں کتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔  
جب میں نے ہنسی ہنسی میں تجھے پکارا تھا تو نہ معلوم کیوں  
تیرے غزوہ عشق کو ٹھیس لگی اور آنکھوں کی کشتی جذبات کے تلاطم  
میں بہ نکلی

اور ساحلِ رخسارِ دم بھر میں آبِ آلودہ ہو گیا۔

میری پجاریں بتلا تو سہی ایک ذرا سی چھیڑ اور یہ محشرِ جذبات؟  
میری خاطر بہ عزت و ناز کیوں کہ تیرا کھلایا ہوا چہرہ فرطِ شرم سے  
اور ننھا سادلِ دارِ فتالی شوق سے تصویرِ درد بن گیا۔

میری آواز کو سنتے ہی تیرے آنسو ان خواب آگین دریچوں  
سے کیوں جھانکنے لگے؟

میں اس نامعلوم راستے کا اجنبی مسافر تھا۔ تیری معصوم  
آنکھیں میری جذباتی کے صدمے سے کیوں اشکِ فشاں ہو گئیں؟  
مجھے دیکھ کر تو سب لوگ ہنسا کرتے تھے۔

بد دعاؤں کے اثر سے میری سانس اتنی گرم ہو گئی تھی کہ  
اس سے آشیانے جل کر خس و خاشاک ہو جاتے تھے۔

میری مسکراہٹ کو سانپ کا من سمجھ کر لوگ جب اٹھنا  
چاہتے تو وہ زہر آمیز پھین بن کر انہیں ڈس لیتی تھی۔

دنیا جس سے ڈر کر گھبرا کر دور بھاگتی تھی اس بد بخت کو  
تو نے کیوں گلے کا ہار بنا لیا۔

اور پھر اسی وحشت زدہ کے لیے تو کیوں سینہ نگار ہو رہی ہے۔  
 کیا تجھے اور کوئی پیار نہیں کرتا؟ اور کوئی تیرا ناز بردار  
 نہیں بنتا؟ کیا تو اوائل زندگی سے جوگن ہے؟  
 یہی ہے ورنہ آنسوؤں کا یہ دریا اور کسی کو کب میسر!.....  
 نہیں یہ نہیں ہے دل کے اندر سے کوئی کہتا ہے کہ یہ نہیں  
 ہو سکتا۔

بارہا طالبانِ دید کو محروم متاثرہ دیکھا ہر پسر بھی تو  
 تشریفِ محبت تھی اور تشنہٴ محبت رہی۔  
 گر صرف مجھے ہی شرابِ عشق سے مرشار کرنے کے لیے تو  
 کیوں بھند تھی؟

میری رانی یہ راز نہ تجھے معلوم ہے اور نہ مجھے، صرف عشق  
 کو اور دل کو اس بھید کا پتا ہو سکتا ہے کہ یاس و حسرت بلا سبب  
 رگ رگ میں کس طرح طاری ہو گئے ہیں۔  
 تجھے نہ جانتے ہوئے بھی اس روز محسوس ہوا کہ میں تجھے  
 ہمیشہ سے پہچانتا آیا ہوں۔

تو وہ ”لینا“ ہے جو جنگل میں بھٹکنے کے لیے ایلی چھوڑ دی گئی تھی  
 تو وہ ہے جن کی آرتی کی تھالی ہمیشہ ٹھکرا دی گئی  
 جس کی مالا ہمیشہ ہنسی ہنسی میں سل دی گئی۔  
 تو وہ دیوی ہے جسے دنیا میں دھنسنے کی بد دعا دی گئی تھی۔  
 تو خاموشی سے ان کلفتوں کو برداشت کرتی رہی۔  
 پہلی ہی نظر میں تو سمجھ گئی کہ تو مجھے شباب ہے اور میں شرمِ محرم

پھر — پچھلے پھر میری روح تیرے لہنوں میں مرتعش ہوئی  
تھی۔ ان گیتوں میں جو لاج کے مارے تھرا رہے تھے۔

نہ جانے کیوں ان الفاظ کے معنی میرے لیے صرف اس جملہ  
میں سمٹ آئے تھے۔ تو مجھے جانتا ہی، روزِ ازل سے پہچانتا ہی۔

متھرا پہنچ کر جب شام رادھا کو بھول گیا تو شاید وہ اس  
کی یاد میں یہی گیت گنگنایا کرتی تھی۔

نل جب دمن کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر چلا آیا تھا تو شاید وہ  
بھی انھیں محسرا انگیز سُرود میں اس کی یاد کیا کرتی تھی۔

جنگلی بھولوں کے ہار گوندھتے ہوئے جب شکنتلا کو پتیم یاد  
آتا تھا تو وہ بھی یہی یاس آفریں گیت گایا کرتی تھی۔

پھاڑوں اور بیابانوں کی خاک چھانتے ہوئے ہمدیو کی یاد  
میں پاربتی نے یہی نغمہ چھیڑا تھا۔

ہاں مجھے سب کچھ یاد ہے۔

لیکن اس وقت شباب محو خواب تھا، تجھے دل نشیں نہ کر سکا  
صرف تیری نغمہ آفرینی کو روح میں بسا کر میں دور دراز کے سفر  
پر حپلا گیا۔

دوسرے ہی دن گوستی کے نشاط افزا کناروں پر دل میں  
چھپی ہوئی تیری یاد نے مجھے خُسن کے اس آہو کی طرح تر پادیا  
جو اپنے سینے میں نافذ مشک رکھ کر اس کی تلاش اپنے آس  
پاس کرتا ہے۔

میں ڈھونڈتا پھرا کہ کس کی یاد مجھے یوں محروم قرار رکھتی ہے۔

یہاں تک کہ میرے واویلوں نے زمین و آسمان کو فراق آشنا بنا دیا۔  
پھول پتیاں، ندی اور پہاڑ سب میرے ہم زبان ہو کر بھاگ  
کے گیت گانے لگے۔

ساتھ ہی میرا ہینٹا نصیب آتشِ شباب میں تپ کر میرے دل کی  
گہرائیوں میں پیاس سے بے تاب ہوا تھا۔

یہ جانِ حزیں جو منزلِ مقصود سے نا آشنا تھی چیخِ پیچ اٹھی کہ  
کون سا ہو وہ دلیں جہاں پیار کا مول لگتا ہو؟  
زندگی اُداس سی رہتی تھی، دل ڈوبا ڈوبا سا رہتا تھا۔  
میں سوچتا تھا جانی کا زمانہ ایک طویل آہ کے سوا کچھ نہیں۔  
آنکھوں کے آگے ہمیشہ دھوپ چھانٹو کے پردے لٹکنے  
رہتے تھے۔

یہ نگہت یاد کہاں سے آ کر میری روح میں سمائی جا  
رہی تھی۔

میرا دل آہوئے رمیدہ کی طرح آپ اپنے سینے میں پوشیدہ  
مُشک کی تلاش میں حیران و سرگرداں تھا۔

یہ خودی کا عشق کتنا عجیب و غریب تھا! اپنی محبت سے  
اپنی تمنا کی خلش مٹانے کی کوشش کتنی حسرتناک تھی۔ میری جوانی  
کی تشنہ لبی کی انتہا نہیں۔ محبت کے دریا اُس کی بوند کی مانند اس  
کے ہونٹوں تک آتے آتے خشک ہو جاتے ہیں۔ ابھی اس پیاس  
کی کوئی حد بھی ہے!

کیسے بچھے؟ یہ پیاس کیسے بچھے؟ کہاں ہے وہ ناپیدا کنارہ۔

دریائے عشق جو اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔

مجھ لاء ابالی رند لمبزی کی تشنگی کو کون بچھا سکتا ہے!  
وہ کہاں ہے جسے کھو کر یہ ساری دنیا میرے لیے ہیج ہے۔  
جہاں سکون میرے لیے حرام ہو گیا ہے۔

کچھ دور اور چل کر دکھیوں۔ اس رستے سے کئی متاتہ خرام  
دوشیزائیں گزرتی ہیں۔ ان کے پیچھے یہ پریم پیاسا دل اندھوں کی  
طرح دوڑنے لگتا ہے اور اگر کوئی ایک نگاہِ غلط انداز ڈال جاتی  
ہے تو خود داری کے احساس سے آنکھیں ڈبڈبا جاتی ہیں۔  
یہ دیکھ کر وہ مجھ پر ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کوئی دروازے  
پر آکر پوچھتی ہے، بھیک لے گا؟

یہ سن کر دل بے مایہ رو رو اٹھتا ہے۔ درد و غم سے  
میرے قیامت خیز جذبات میں آگ سی لگ جاتی ہے۔  
اور جب وہ چنچل لڑکی بجائی چتونوں سے بھیک کا پیالہ میری  
طرف بڑھاتی ہے تو میں اسے ٹھکرا دیتا ہوں۔  
وہ روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے اور خوف کے مارے میرے  
پاس کوئی نہیں آتا۔

”گو تم“ کی یہ جان عزیز کشکول گھامی بے محبت کی بھیک  
مانگنے در در صدا لگاتی پھرتی ہے۔

میری آواز سن کر کتنے آتے ہیں کتنے حیرت و تردد لے کر  
لوٹ جاتے ہیں۔

کسی کے دل میں ٹھیس لگتی ہے، کسی کی آنکھیں چمک

جاتی ہیں

میں بھیک میں ماپہ جیات مانگتا ہوں پھر بھلا یہ دُنیا دار  
میرے سوال کو کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

پہلے تو تسخر اڑاتے ہیں اور پھر خود بھی پشیمان ہو کر دوستے  
ہوئے لوٹ جاتے ہیں۔

پوچھتے ہیں مسافر کہ تو سہی تو چاہتا کیا ہے؟ تیری آواز  
میں کیس کی آتش تننا سلگ رہی ہے؟ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا  
کوئی تن من لاتا ہے، کوئی متارح حسن، کوئی دولتِ جمال۔  
کوئی سفورہ راج کماری دولت کے نشے میں چور ہو کر مجھ  
پر جوانی کے منتر پھونکتی ہے۔

گر ان سب کی طرف میں آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔  
مایوس ہو کر میں بادیہ پیمائی میں معروف ہو جاتا ہوں۔

آہ! میری وہ پجارن کہاں ہے جو کہے کہ میرے مالک نیں  
تیری خاطر جگن بنی تھی۔ کیا تو مجھے پیار نہ کرے گا؟ میرے  
پاس محبت کے سوا کچھ نہیں کیا تو اس ٹخنے کو قبول نہ کرے گا۔  
اس ریگستان میں آبلہ پائی سے کیا حاصل جہاں یہ پیاس  
شدید تر ہو جاتی ہے۔

مراب صحرا بن کر کوئی آنکھوں کے آگے آتا اور پھر اوجھل  
ہو جاتا ہے۔ صرف یہ نذا جس کارواں بن کر کالوں میں آتی ہے۔  
میرے مالک نہیں بھیک نہیں۔ تجھے چاہتی ہوں۔ میں  
تجھے جانتی ہوں اور تو مجھے پہچانتا ہے۔

میں سمجھ نہ سکا کہ یہ میری ہی صدائے بازگشت ہے۔ نہ یہ دریا ہے اور نہ ساحل۔ یہ سراب صحرا کے سوا کچھ نہیں۔



میں جب تیری نگری میں آیا تو میری زندگی خون آلودہ اور کانٹوں سے چھدی ہوئی تھی۔

اس وقت تک مجھے خبر نہ تھی کہ میری جبین میرے سینے میں پیوست ہو کر کسک بن جاتی ہے۔

تاہم محسوس ہوتا تھا کہ تیری ممنور کن قرابت میرے تمام مصائب کو دؤر کر دے گی۔

ہمدم! معلوم ہوتا ہے کہ میرے دل میں تیری یہ فریاد تڑپ رہی ہے۔ مسافر، یہ کانٹا مجھے نکالنے دے۔ بتا تو سہی کہ درد کہاں ہے اور کیوں ہے؟

بے زبانی تیری زبان تھی، خاموشی تیری گویائی تھی۔ آہ! تیرا نغمہ تھی۔ اس لیے یہ دل تنگ سب سن کر بھی نہ سمجھ سکا کہ اس التجا میں ناکام محبت داد طلب ہے۔



اس کشمکش کے عالم میں جب اندھیری رات موسلا دھار بارش میں بہا رہی تھی، نہ جانے کہاں سے میری ماں آئی اور مجھے گود میں اٹھا کر ان روتی ہوئی آنکھوں کو بار بار چوم لیا۔ پھر نہ وہ بے راہ روی رہی نہ وہ شورش طلبی۔ اس کے بوسوں نے آتشِ غم کو سرد کر دیا۔ ناکامی کی تیرگی میں ماں کی

ماتا گلنڈ کی طرح جھلکا اٹھی۔

ایک عرصہ دراز کے بعد وہ آشفتم مزاج خانہ زاد آوارہ گردی سے تھک کر گھروٹ آیا۔ اور اسے سکون ملا تو ماں کی شفقت میں۔ اس کے آوارہ ترازوں کی گونج شفقتِ مادری کی تیز ہواؤں میں گم ہو گئی۔

مگر ایک بار اور میں اپنے رستے سے ہٹکا :- جب یہ معلوم ہوا کہ ایک شوخ سینہ میرے در کی زنجیر کھٹکھٹا رہی ہے تو مجھے یاد نہ رہا کہ اب تک میں کس کی تلاش میں کھویا ہوا تھا۔ یہ بھی بھول گیا کہ میں کس پوجا کے پھولوں کا طلبگار تھا۔ حسرت دیاس کا پتہ نہ رہا۔

گویا شادی مرگ سے دل کے بند بند کھل گئے، بے اشک آنکھیں پھر آنسوؤں سے چمک اٹھیں۔ کسی کی عطر پیزی سے روح جھپک اٹھی۔

فراق و وصل کی ہنگامہ خیزیوں میں زندگی بھنور میں بڑھی ہوئی کشتی کی طرح ڈلگانے لگی۔

ایک بار بچ کر یہ گل دیدہ بلبل پھر دام صیاد میں آ پھنسا...  
مندر کی صورت میرے خون میں ڈوب گئی تو بھی وہ پتھر کی صورت بے حس ہی رہی۔

یوں ذلیل ہو کر غزورِ عشق انتقام کی آگ میں کود پڑا اور میں اٹھب بغاوت پر سوار ہو کر بادلوں کو چیرتا اور نعرے لگاتا ہوا

اس خدائے قہار کی طرف جھپٹ پڑا جو سارے مصائب و آلام کا خالق ہے۔

نقیبِ قیامت ستارہٴ تخریب سن کر میں نے اس عالم صحرائی میں جو آپِ محبت سے یکسر خالی ہے خون اور آگ کے دریا بہا دیے۔  
لیکن یہ فریب ہستی! میرے محبوب! بیچ بیچ میں محسوس ہوتا تھا کہ تیری بانسری کہیں دور میرے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔  
اس نامعلوم دور افتادہ منزل کی طرف دیکھتے ہوئے ان آنکھوں میں درد مندی کے آنسو تیرے گلتے تھے جن کی پلکیں خون آلودہ نہیں مجھے یقین ہو گیا کہ ایک توہی جنگل کی وہ شہزادی ہے جو میرے لیے پھول چننا کرتی ہے اور بڑے جتن سے ایک ہار بنا کر اپنے پاس رکھ چھوڑتی ہے۔ میری بھکارن! معلوم نہیں شرم و حیا کے بھولپن میں کتنی مدت سے تیری صحبت کا سدا بہار پھول کھلا ہوا ہے۔

دل کے اندر موجیں مارتا ہوا دریائے اندوہ کھلکھلا کر کہتا ہے:  
”پہچان گیا۔ جسم مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی!“ یہ آواز تو اس کی ہے جس کے بغیر اس وسیع دنیا میں تجھے کہیں سکون مہسرنہ تھا۔  
مگر ساتھ ساتھ نالہ و شیون کی یہ روح فرسا صدا کیسی جیسے کوی پیچھے سے چپکار کر کہتا ہو دوست! ابھی وقت نہیں آیا۔ تو بھی میں نے سنی ان سنی کردی۔ چشمِ زدن میں بجلیوں پر بیٹھ کر تیری رگِ جاں سے بھی قریب آ گیا۔

نہ معلوم وہ داہِ فنا، وہ خونیں پرچم، وہ آتشیں رتھ کیا ہوتے اتنا یاد ہے کہ تیرے آغوش میں سکون و اطمینان کے پھول کبھرے ہوئے تھے۔

اس کے بعد میں جو کہنا چاہتا ہوں اس کے بے الفاظ نہیں ملنے  
اب نہ دل میں دھڑکن باقی ہے نہ آنکھوں میں آنسو اور نہ امید  
میں تقویت ۔

اب جو کچھ کہوں گا وہ گیت نہ ہوگا۔ یہ وہ نومہ ہے جسے خون دل  
ناکامی کی زبان میں بیان کر رہا ہے۔

تم سوچتی ہوگی کہ اس کنگال کی بے حیائی کی بھی کچھ انتہا ہے کہ  
شرف و عزت کا ستنی رہتا ہے۔

در اہل یہ حقیقت کتنی اگلیز ہے! اب میں بھی ان باتوں  
کے تصور سے ہنس دیتا ہوں۔

مگر میرے محبوب نہ بھول کہ در در کی خاک چھان کر میں تھکا ہارا  
تیرے پاس آیا تھا۔ پتے پیار کی جو تھوڑی بہت کائنات رہ گئی تھی  
اس کا ہدیہ میں نے ڈرتے ڈرتے تیرے سامنے پیش کیا تھا۔ اسی  
سنگرا کس ذوق و شوق سے میں نے اپنی کم مائیگی کے احساس  
کے باوجود تیری پوجا کے سامان کیے تھے۔

سوچا تھا کہ جس بار کو یہ ہوس ناک دنیا نہ اٹھاسکی اسے تو  
خوشی سے سنبھال لے گی۔ اس ازلی باغی کو تو پابند محبت بنائے گی  
سوچا تھا کہ اس سرکش و خود سر پر فتح پاکر تیرا عشق روشن  
ہو جائے گا۔ بعد ازاں میرے ناتواں بازوؤں میں تیرا خلوص وہ  
زور پیدا کر دے گا کہ میں نعرۂ بغاوت بن جاؤں گا اور تو بغاوت  
کی بجلی ۔

دل میں یہ آرزو تھی اور اس کی تمکین کی یہاں تک

جہاں تھی کہ میں دنیا کی ساری رنگینیوں کو تجھ پر نشانہ کر سکتا تھا۔  
لیکن آہ! نہ وہ جوشِ ہر نہ وہ دلولے نہ وہ خلش و تپش!  
یہ ایک تو زمانے کی طرح بدل گئی۔ عجب کہ تو بھی کرو فریب  
کے دام میرے لیے بچانے لگی۔

میرا سینہ ہمیشہ سے حقیقت سے منور رہتا ہے۔ اس کی  
دوڑیں نگاہیں خون کی ایک ایک بوند کو پرکھ سکتی ہیں۔

تیری پوجا کو جس لالچ نے آج گناہ آلودہ کر دیا، کیا وہ  
مجھ سے چھپی ہوئی ہے؟ آج تو اسے بھولنے کی کوشش کر رہی ہے  
کل تک تو نے دل و جان جس کے سپرد کر رکھا تھا۔

میں حیران ہوں کہ تیرے شفاتِ دل پر گناہ کی لکیر کس نے  
کھینچ دی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تو بھی فریب دینا سیکھ جائے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تو کوئی فریب خوردہ نہیں تو کیوں نہ اس جھوٹی  
دنیا میں آگ لگا دی جائے!

میں اور تو، چاند اور سورج، ارض و سما سب فریبِ زندگی  
کے شکار ہیں۔

جلادے اسی بیدادگر اس جھوٹی دنیا کو اپنی عشرہ طرازی سے  
جھلسادے۔

آج جو میں تیری طرف نظر اٹھاتا ہوں تو خود داری بجلی بن  
بن کر دل کے آسمان میں کوندنے لگتی ہے۔ تیری بیوفائی اور اپنی  
بے حیائی کا احساس سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ

زمین شق ہو جائے اور اپنی اس حسرت نصیب اولاد کو اپنے دہن میں سمیٹ لے۔

جب کبھی امید کی ایک آدھ کرن چمکتی ہی تو اس کی طرف دیکھتے ہی سارے حوصلے پست پڑ جاتے ہیں۔

ہائے! کہاں ہی وہ پجارن، وہ جوگن۔ کیا یہی بے درد، تندو وہ پیکرِ عصمت ہی؟

میری زندگی کو اس نے کھلونا کیوں سمجھ لیا؟ میرے ارماؤں کو اس کے ادائیگی سے وہ کیوں کچل رہی ہے؟

ان بتوں کے آگے وفا شعاری کی کوئی قیمت نہیں۔ عورت کی ہوس کی انتہا نہیں۔ ایک کی پرستش اسے مطمئن نہیں کر سکتی۔ وہ ہمیشہ بہت سے چاہنے والوں کی جو یا رہتی ہے۔ جس کے لیے میں خدا کی عبادت سے منحرف ہو گیا آج وہی یوں مجھے قعرِ مذلت میں گرا رہی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اب میں اپنی منزل کو پہچان گیا۔ کیوں نہ اب میں موت در آغوشِ طوفان کا ہم سفر بن جاؤں۔ راستوں میں کس کی یاد میں زیاد کرتا بھروں؟

کیوں نہ اس بار آتشِ فشاں پہاڑ اپنے غارت گر دہانے کھول دیں؟ کیوں نہ میری گرم گفتاری بغاوت کے جھنڈے لہرا دے اور موت کے فرشتے میرے ہم سخن بن جائیں؟

لے آؤ اپنے آتشیں رنج اور پھونک دو ہنگامِ قیامت کے

صور۔ نکالو زہر و آتش میں بجھے ہوئے تیر۔ برباد کر دو اس  
دنیا کے معصیت کو۔ ٹپکادو یہ خونیں شرابِ عزرائیل کے گلے میں  
تہ و بالا کر دو اس عصیان کدہ کو اپنی ٹھوکروں سے!۔



دراں حالے کہ دلِ صد چاک میں غضب کی جلن ہے ،  
تو بھی او ظالم! مجھے خوب یاد ہے کہ جب تک میں تجھے قابلِ امتنا  
نہ سمجھتا تھا، جب تک میں محبت کی ابلہ فریبیوں سے  
ناواقف تھا تب تک تو حریمِ محبت کی گداگر تھی۔ سہاگ کے  
دو چار تنکے چننے کے لیے تو کس طرح میرے آستانے کی جبینِ سائی  
کرتی تھی۔

میں تیری نظر فریبیوں سے بچا رہا۔ آج کیا تو اسی کا  
انتقام لے رہی ہے۔ اب میں موت سے ہم آغوش ہو کر سسک  
رہا ہوں۔ بے درد! کیا میرا دل اسی بے عفا کہ یوں چور چور  
کر دیا جائے۔

اس کرم کی نگاہ کے بعد اس کو رجسٹری کو میں کیوں کر  
برداشت کر سکتا ہوں۔

عورت! اگر مرد تیرے جذبات کی یوں تخفیر کرتا تو تو اسے  
کیا کیا دشنام نہ دیتی؟۔

سوچتا ہوں کہ کچا ہر معصوم دوشیزہ کا بوسہ ایسا ہی ہوتا ہے  
کہ دل میں داغ بن کر رہ جاتے۔

نہیں یہ نہیں ہے۔ نسیم کلی کے دل کو گدگد کر پھول

کھلاتی ہے مگر صرف بھونرے کو معلوم ہوتا ہے کہ کیوں کر پھول کا دل چاک کیا جاتا ہے۔

•

جب بہار کا چل چلاؤ تھا میں آہستہ خرام باد پہاری کے ساتھ اس دلیں کو چل دیا جہاں نہ حیات ہی نہ موت، ہمیشہ اندھیری رات کا سایہ رہتا ہے۔  
اس دن کو یاد کر کے آج بھی میں لبریز مسرت ہو جاتا ہوں جب میں الوداع کہہ رہا تھا اور آنکھیں فرط انبساط سے رونے لگی تھیں۔

میں جب تجھے پیار نہ کر سکا تھا، تو نے ہی پہلے پہل میرے ہونٹوں سے پریم پیالہ لگایا تھا۔

اب تک میرا بے تاب آغوش ان حیات آفریں سانسوں کی پٹ کو محسوس کرتا ہی جو دوشیزگی کی دُنیا سے چلی تھی۔  
اخلاص و محبت کی ان رنگینیوں سے یہ زندگی چمک اٹھی اس حد تک کہ اب میں موت میں کوئی تلخی محسوس نہیں کرتا۔  
جب اپنے موت درکنار ہونٹوں پر تیرے حسین و جبین پوسوں کی لرزش محسوس کرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ تیرے نام کو ہزار بوسے دوں۔

•

میرے محبوب! ایک آرزو ہے کہ جب کبھی جدائی کی راتیں کسی دوسرے کے لیے راحت کا پیام لے کر آئیں اور تو اپنے

ذرت زدہ دل میں کھٹک سی پائے تو کوئی تجھے بتادے کہ  
وہ ڈکھیارا اب اس دنیا سے سدھار گیا۔

کبھی یہ نہ ہوگا کہ تیرے بوسے کی گرمی کا تصور ایسے مذی  
نالوں کو پار کرتا یہاں تک لے آئے گا۔

وہ رشک و حسد کا ہتلاہ، وہ غرض و نفس کا بندہ تو مر گیا

اور لازوال بنا گیا اسے جو جدائی اور ناکامی میں محبت کا  
راز داں ہو کر شاعر بن گیا۔



## دریا گائیت

معلوم نہیں میں کس منزل کی طرف جا رہا ہوں۔  
 اس بحر بیکراں میں خوشی اور غم کی موجیں تھپیڑے مار  
 رہی ہیں اور میری زندگی کی کشتی ان ہی موجوں میں ڈاٹواں  
 ڈول ہو رہی ہے۔ آفرینش کی سوت سے نکل کر آپ اپنی روائی  
 میں بہا جا رہا ہوں اور یہ راہ بے منزل کبھی فتح نہیں ہوتی۔  
 شب و روز صحرا نوردی میں مشغول ہوں کہ ازلی غریب الوطن  
 ہوں۔ دنیا میں آتے ہی مسافر بنا اور دشت و جبل کی خاک  
 جھانتا پھرا حتیٰ کہ کبھی وطن کی خاکِ پاک کو پوسہ نہ دے سکا۔  
 میں آسمان کے آغوش سے مثل برف پھل کر نکل آیا،  
 کبھی یہاں تڑپا، کبھی وہاں چکا۔

— پی —

بالسری کی لُسن کر نھاسا ہرن اپنی ماں کی مانتا بھلا کر  
 جس راہ پر چل نکلتا ہے،  
 جھرنے کے دائی تارے سننے کو خرگوش جس سمت بھاگتا رہتا  
 ہے، بلبل جس نوا کو سُن کر دیوانہ وار اپنے نازک پر کھونے لگتا  
 ہے، بادل جس پکار کو سُن کر سمندر کی الفت کو فراموش کر کے  
 آسمان کی طرف پیکتا ہے۔  
 بس! اسی ندا کو سُن کر اسی راستے پر میں بھی چل

لکھڑا ہوا ہوں۔ جنگل، پہاڑ، آبادی اور ویرانے پر ایک نگاہ  
 غلط انداز ڈال کر میں اسی منزلِ نامم کی طرف بھاگ رہا ہوں۔  
 میں بھی گویا شہابِ ناقب ہوں۔ ستاروں کی محفل تک  
 پہنچنے کا زہینہ ہوں۔

نہ معلوم میں کہاں جا رہا ہوں۔ انسان میرے کنارے  
 گھروندے بنا کر سمجھتا ہے کہ یہ میری موجوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔  
 دو شیرازوں کے گروہ میرا پانی صراحیوں میں بھر کر لے جاتے  
 ہیں۔ اور میرے سینے کے اندر چوڑوں کی کند ڈال کر میرے  
 جذبات کی لہروں میں ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ انھوں نے صحت  
 میرے پانی کی شیرینی کو چکھا ہے۔ یہ نہیں دیکھا کہ میرے ساحل کے  
 دونوں طرف مرگھٹ کی آگ سلگ رہی ہے جس سے اماؤں  
 کے لاشے خاک سیاہ ہو رہے ہیں۔

مجھ بد نصیب کو اب تک نہ معلوم تھا کہ زندگی کا جوہر  
 اس کی روانی میں پوشیدہ ہے۔

میرے کنارے کے ہر گھاٹ پر گفتگو کی جھنکار سنائی  
 دیتی ہے اور حسینوں کا خرامِ ناز لہروں کے گیت سے گت ملا کر  
 نضا کو مسترجم کر دیتا ہے۔

گڈریا۔ ساحل کے پاس ایک درخت کے سایہ میں بیٹھا  
 بانسری کی تان اڑا رہا ہے۔ چاند آسمان پر جلوہ افروز ہو کر  
 میری آرسی میں اپنا منہ دیکھتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں — خوب  
 سمجھتا ہوں کہ میرے دونوں کناروں پر فریبِ حسن کا جال بچھا کر

وہ میرے دل بے قرار کو مسحور کر لینا چاہتا ہے۔  
ادھر دیہات کی کچھ کافراؤں کا اصرار ہے "اے ذری ٹھہرتو  
جانا! ہم ایک ہڑکٹ لیں!"

میں جا رہا ہوں! — عدم کی طرف یا دوام کی طرف؟ —  
کیا معلوم!

بس اتنا دیکھتا ہوں کہ کہیں کہیں سینوں کے غول میرے  
ساحل پر جمع ہو کر دل نشیں نغمے چھیڑ دیتے ہیں کہیں کوئی حسن  
کی دیوی بناؤ سلگھار کیے ناؤ پر سہمی سہمی بیٹھی ہے جس کی توار سے  
مجھے ایسے ٹھوکے دے جاتے ہیں کہ لہروں کا کلیجہ پھٹ جاتا ہے  
اور ان نادان لہروں کو دیکھو۔ کس ایمانِ راخ سے میرے  
قدموں کو چوم رہی ہیں۔

افسوس میری گردش رفتار اور انتشارِ قلب کا احساس  
انہیں نہیں ہے۔

آدھی رات کے وقت حکام دیوتا کی بھجان سب کی سنگھیں  
بچا کر میرے ساحل پر پناہ گزین ہوتی ہے۔ میری لہریں ایک دوسرے  
کو گہنی مار کر کھلکھلا کر کہتی ہیں! "ہم پہچان گئے! اسی جوگن  
تو گھر بار چھوڑ کر تندی کی عین گہرائیوں میں سکون ڈھونڈنے آئی تھی۔"  
دنیا سے منہ موڑ کر کسی بے وفا کی تلاش میں وہ میرے پاس  
آئی تھی اور وہ دیکھو اسے اپنے دامن میں سمیٹ کر میں پھر اپنی  
راہ پر روانہ ہو جاتا ہوں۔

ماٹھی کا افسانہ ریت پر لکھا جاتا ہے جسے مستقبل آئینِ واحد میں صرف غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔

جانے وہ کون سی کشش ہے جو مدعا اور مقصود سے بے نیاز بنا کر مجھے یوں کھینچے لے جاتی ہے اور راہ جتنی طو ہوتی جاتی ہے منزل بھی اتنی ہی دور تر ہوتی جاتی ہے۔

تاہم میں پیچھے لوٹ کر نہیں دیکھتا اور لہروں کا ترنم مسلسل پہی کہے جاتا ہے کہ — ”جل جل ، جل جل“

شام کو کنبے کے سب لوگ واپس ہو جاتے ہیں اور اپنی یاد دلانے کے لیے مرگھٹ میں کچھ مجھے مڑجھائے ہوئے پھول چھوڑ جاتے ہیں اور آہ ۱ میں اپنے ساحل پر چلنے والی لاش کی خبر گیری کے لیے تن تنہا رہ جاتا ہوں۔

درد جو چٹکیاں لیتا ہے تو سینے سے بے اختیار شیون کی صدا بلند ہوتی ہے مگر اس خاموش فریاد کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔



ارے نادان! چل، جلدی چل۔ اب تک تو نہ سمجھا تھا کہ تجھ میں جو گندگی حلال کر گئی ہے، وہی تجھے مضطرب کیے ہوئے ہے۔ آنسوؤں کی بوندیں اسے پاک کر دیں گی مگر وہ دیکھ سمنہ تیرا منتظر ہے جسے آنسوؤں کی بوندوں نے وہ وسعت بخشی ہے کہ وہ آسمان سے ہم آغوش ہے۔



## مجھے یاد کروگی

مجھے یاد کروگی — اُس دن جب میں اس سرائے فانی میں  
نہ ملوں گا۔

ستارہ شام سے میرا پتہ پوچھوگی اور میری تصویر کو دل میں  
چھپا کر پُرشور دریاؤں، دہکتے ہوئے ریگستانوں، فلک بوس پہاڑوں  
اور گھاتی ہوئی ہواؤں میں مجھے ڈھونڈتی پھروگی۔

مجھے یاد کروگی — اُسی وقت جب چونک کر خواب سے  
جاگ اُٹھوگی اور کسی کا جانا پہچانا سایہ تمہارے دھڑکتے ہوئے  
قلب پر تھر تھرائے گا۔ تم سمجھوگی کہ میں ہی تمہاری آغوش میں  
آ لیٹا ہوں۔ لیکن جب سونے بسز اور خواب رنگیں کی یاد کے سوا  
کچھ نہ ملے گا تو دردِ دل آنسو بن کر آنکھوں میں چھلک آئے گا۔

مجھے یاد کروگی — اُسی وقت جب تمہارے رباب کے  
تار یکا یک ٹوٹ جائیں گے اور سب یہ کہہ اُٹھیں گے کہ یہ تو اُسی  
سہ سخت کا سکھایا ہوا گیت ہے۔ پھر تم ان دل ربا صحبتوں کو یاد  
کرو گی۔ اور رباب خود بخود بروگ کے گیت گانے لگے گا۔ تم لاکھ  
ضبط کرو لیکن دل بیتاب آنکھوں کے پیالے کو اُچھال ہی دے گا۔  
مجھے یاد کروگی — جب جنبیلی کے پھول تمہارے آنگن  
میں ایک ردائے سپید بھادیں گے۔

ان کا گجرا بنانے بیٹھوگی تو یکا یک تمہاری چوڑیوں میں اڑیں

پیدا ہوگا اور مُرجھائی ہوئی کلیاں چُپکے چُپکے رونے لگیں گی۔  
 تمہیں محسوس ہوگا کہ میرے مزار کا ایک ایک ذرہ نارگنتاں ہے  
 اور آشفتمہ برگِ گلِ شبنم سے اُس کی آبِ پاشی کر رہے ہیں۔  
 مجھے یاد کرو گی — جب تمہارا تصور آتشِ فرقت کی ڈور میں  
 آنسوؤں کی مالا گوندھ کر تمہارے جسم کی نذر کے لیے لائے گا۔  
 مجھے یاد کرو گی — جب سادوں کی محرابِ بدوش ہوائیں جوانی کے دلوں  
 سے سرگوشیاں کریں گی۔ وہی زمین ہوگی اور وہی آسمان۔ صرف منزلِ موت  
 کا وہ مسافر نہ ہوگا۔ اپنے سپہیں بازوؤں میں آپ اپنے کو لپیٹ کر تم اس  
 شورِ یرہ سر کے بوسوں سے لذت اندوز ہونے کی سعیِ لامحالہ کرو گی۔  
 اور جب بیچ کا سونا بن دل میں ایک سیٹھی سی ٹپکی لے گا تو مجھے یاد کرو گی۔  
 مجھے یاد کرو گی — جب گنگا کی نہنگ آسا موہیں ناؤ سے اٹھیلیاں کرنے  
 لگیں گی۔ تمہیں وہ رات یاد آئے گی جب ہم دونوں اس ناؤ پر بیٹھے ہوئے  
 تھے۔ دونوں کناروں پر تاریکی تھی اور بیچ دریا میں محبت کا چراغ روشن تھا۔  
 مجھے یاد کرو گی — جب آسمان سہانی چاندنی سے دُرشاں  
 ہو جائے گا اور ہر دہانچہ کے سرگم میں میرے گیت کی صدا میں  
 گونجیں گی۔ تمہاری ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں آسمان میں اس ستارے کی  
 تلاش کریں گی جو میری ہی طرح پُر حسرت اور درد مند تھا۔  
 مجھے یاد کرو گی — جب ہیبت ناک طوفانِ رقص کرے گا۔ موسلا چھا  
 برکھا دُنیا کو جل تھل کر دے گی اور تمہاری کٹیلا لرز نے لگے گی۔ کوندے کی  
 لپک کے ساتھ تم دہشت سے چیخ اُٹھو گی اور ان بانوؤں کو یاد کرو گی  
 جو اس ڈراؤنی شب میں تمہیں مافیت بخش سکتے تھے۔ اسے یاد کرو گی  
 جس کا گرم بوسہ تمہارے قلبِ مضطرب کو گرا دیتا تھا۔

تیسرا دور

اشتراکیت



## اشتراکی

میں اس مساوات کے گیت گاتا ہوں جہاں پہنچ کر سب خلتا تھا  
اور تفرقے مٹ جاتے ہیں۔

جس کے سایے میں ہندو اور بودھ، مسلمان اور عیسائی ہمدوش  
ہو جاتے ہیں۔

میں اسی مساوات کا نغمہ سنچ ہوں۔ تم کیا ہو؟۔ پارسی، عینی  
یا یہودی۔ بو تو وہی کیا ہو؟

تم جو بھی ہو تمھاری مرضی ہے۔

پیٹھ پر تم خواہ کتنی ہی کتابوں کا بار لاوے پھرو۔

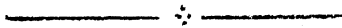
قرآن، پران، انجیل، وید، تمھارا جی چاہے تو گھول کر پی جاؤ۔  
لیکن یہ تو کہو اس دردِ سر سے مدعا کیا؟ ان کاغذی پھولوں  
پر جان کیوں دیے دیتے ہو۔ وہ دیکھو بانج جہاں میں جن بندی  
ہو رہی ہے۔ سارے زمانے کے علم کو کھنگالنے والو! ذرا  
کتابِ دل کی طرف بھی تو ایک نظر دیکھ لو۔

تمھیں اپنے نفس میں دینِ حق کا چراغ جگلاتا ملے گا۔ اور  
تمھارا دل وہ کعبہ ہے جو بنی نزعِ انسان کا قبلہ تھا ہے۔

مردہ دیوتاؤں اور فرسودہ کتابوں کی تلاش میں ناختم ماہے مار  
پھرتے ہو۔

تمھارا دل جو مشعلِ نور سے اس کو چشمی پر حقارت سے ہنستا ہے

بڑے بڑے تاج دار اسی دل کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں  
 وہی تیرتھ ہے۔ وہی کعبہ ہے۔ وہی کاشی ہے وہی یروشلم ہے۔  
 دیر و حرم، کعبہ و کلیسا، سب کچھ اسی دل میں ہے۔ عیسیٰ اور  
 موسیٰ نے اسی خانہ دل میں بیٹھ کر حق کی جھلک دیکھی تھی۔  
 یہی وہ میدانِ جنگ ہے جہاں کائنات نے گیتا کا ورد کیا۔  
 اور اسی کوہ میں بیٹھ کر نبیوں نے حقیقت کی نقاب پائی۔  
 یہی وہ کوہِ ندا ہے جہاں گوتم بودھ نے مظلوم انسانیت کی سپکار  
 سُنی اور اس کی نجات کی خاطر راج پاٹ تاج دیا۔  
 اسی دل کے مندر میں بیٹھ کر رسولِ عربی نے اپنا پیغام سنایا  
 ہمد تو کس فریب میں مبتلا ہے۔  
 پتھر جان کہ اس دل سے بڑی کوئی سجدہ گاہ نہیں ہے۔



## خدا

تم آکاش پاتاں اور دشت و جبل میں کس خدا کو ڈھونڈتے پھرتے ہو۔

در ویشو صوفیو! تم نے بھی کمال کر دیا۔ دنیا تمہارے منہ کو

تک نہ ہی ہر اور تم ہو کہ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہو۔

خالق کی تلاش! یعنی تم آپ اپنی تلاش میں سرگرداں ہو۔

عقل کے اندھو! دل کی آنکھوں سے دیکھو تو آئینہ میں

تھیں اپنے چہرے کی ہر رگ پر اس کی صورت نظر آئے گی۔

یہ سن کر آگ بگولاً نہ ہو جاؤ۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ہی اللہ میاں

کے پرائیوٹ سکریٹری ہو۔

ہر شے میں اُس کا نور ہے اور ہر انسان سے وہ شناسا ہے۔

سوداگر ساحل پر بیٹھ کر موتیوں کا سودا کرتے ہیں لیکن

انہیں سمندر کی عقاہ کیا معلوم۔ یہ موتی کو پرکھ سکتے ہیں لیکن

سمندر کی گہرائی کی خبر انہیں کیا۔

اس سمندر میں یہ گہرے کبھی نہیں گئے۔

ہمد! تو ان کتابوں کو چھوڑ اور دریائے حقیقت کے اندر

بیٹھ کر دیکھ کہ کیا تماشا نظر آتا ہے۔

## انسان

میں مسادات کے گیت گاتا ہوں۔

انسان سے پُرا کوئی نہیں ہے۔

ہر زمانے میں، ہر ملک میں، ہر نسل میں، جتنے انسان ہوتے ہیں۔ سب ایک ہی رشتے میں منسلک ہیں۔ وہ سب انسانیت کے زمرے میں شامل ہیں۔

پُجاری! دروازہ کھول! بھوک کا دیوتا دیر سے کھڑا ہوا ہے۔  
اُمٹھ کہ پوجا کا وقت ہو گیا۔

خواب میں یہ ندا سن کر پُجاری چونک کر اُمٹھ بیٹھا اور عبادت گاہ کا دروازہ کھول دیا۔ سوچا کہ دیوتا کا کرم ہو تو سب دلدر دور ہو جائیں۔

مسافر کے کپڑے تار تار تھے اور وہ بید مجذوں کی طرح لاغر تھا۔ بھوک سے کانپتی ہوئی آواز میں بولا ”بابا سات دن کا بھوکا ہوں“

مگر جب دروازہ بند ہو گیا تو ہراساں بھکاری اندھیری رات میں جاڑے میں کانپتا ہوا وہیں گر پڑا۔ بھوک کی آگ میں وہ جلا جاتا تھا۔ اس نے چیخ کر کہا۔ ”دیوتا۔ یہ تیرا نہیں پُجاری کا مندر ہے۔“

کل مسجد میں کہیں سے کھانا آیا تھا۔ پلاؤ تورمہ کی رکابیل

کو ملا لپھائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت ایک مسافر آیا جس کا جسم تکان سے چرچور ہو رہا تھا، بولا "بابا! کئی روز سے فاقہ کر رہا ہوں"

"ملا نے دیدے نکال کر کہا" مردود یہ تیرے گناہوں کی سزا ہے۔ کبھی نماز بھی پڑھتا ہے؟"

بھکاری نے کہا "جی نہیں" ملا نے چیخ کر کہا "ملعون نکل خدا کے گھر سے" یہ کہہ کر مسجد میں اس نے قفل جڑوایا۔

فقیر نے آہ بھر کر کہا۔ "یارب استی سال کی مدت میں میں نے تجھے کبھی یاد نہیں کیا۔ تاہم میری روٹیوں پر تو نے پابندی نہیں لگائی۔ تیرے مندر و مسجد پر انسان کا کیا اختیار ہے؟ پنڈتوں اور ملاؤں نے ان پر قبضہ کیوں کر رکھا ہے؟"

ہلاکو، چنگیز، غزنوی اور کالا پہاڑ کہاں ہیں؟ ان متفعل عبادت گاہوں کو توڑ کر کیوں نہیں پھینک دیتے۔

خدا کے گھر پر کون تالا جڑتا ہے۔ کون نہ بھیر لگاتا ہے۔

لاؤ ہتوڑی اور گناہ۔ مسافر کو دو ان مسیہ خانوں کو۔

ای عبادت خانو! تمہارے میناروں پر چڑھ کر منافقت

نفس پرستی کا پرچم اڑاتی ہے۔

مجھے انسانوں سے نفرت ہے۔

قرآن وید اور انجیل کو چوم چوم کر یہ کبھت مرے جاتے ہیں

یہ ناسمجھ کتابوں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی انھیں بتلاتے کہ

انسان کتابیں بناتا ہے۔ کتابیں انسان پیدا نہیں کر سکتیں۔ اور ان مردہ کتابوں کے صدقے میں زندہ انسان ایک دوسرے کا خون پنی رہے ہیں۔

ہم سب کی رگوں میں مذہب کے بانوں کا خون بہ رہا ہے۔ ہم انھیں کی اولاد ہیں۔ ہم بھی ان جیسے انسان ہیں۔ معلوم نہیں۔ ہم میں سے کون ان کے رُبتے کو چھل کرے۔ ہمد، میرا مذاق نہ اٹاؤ۔ ”انا“ کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟

ممکن ہے کہ ہمیں میں کوئی کل جگی اوتار ہو، کوئی ہدی ہو، کوئی عیسیٰ ہو۔

پھر تو کس سے نفرت کرتا ہے۔ کس پر وار کرنا چاہتا ہے؟ ارے نادانو! اس کا سینہ بھی بیت اللہ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بیمار اور نحیف ہے، اگر نادار اور مفلس ہے تو کیا ہٹاؤ؟ دنیا کے تمام عبادت خانے اس پیکرِ خاکی سے زیادہ مقدس نہیں ہو سکتے۔

ممکن ہے اس دکھیاری عورت کے بطن سے ایک ایسا انسان پیدا ہو جو تاریخِ عالم میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔

جس بطل نور کو آج تک دنیا نے نہیں دیکھا، جس نذا کو سننے کے لیے زمانہ اب تک گوش برآواز ہے، ممکن ہے کہ وہ اسی کی جھونپڑی کو نوازے۔

انھیں گورکن کہ کر حقارت سے نہ ٹھکراؤ۔ ان کے اندر

نہ جانے کتنے ہرشیچندر پیچھے ہوئے ہیں۔ کل انہیں میں سے کوئی سر بلند ہوا تو تم اسی کی آستاں بوسی کو اپنی معراج سمجھو گے۔  
گوالا کہہ کر اسے کیوں نفرت سے دیکھتے ہو۔ ہو سکتا ہی کہ ان میں پھر کوئی کشن پیدا ہو۔

کسان کے نام پر ناک بھوں کیوں چڑھاتے ہو۔ پوچھو تو وہی اس دنیا کا سر تاج ہے۔

ان گڈریوں پر نہ ہنسو۔ انہیں میں ایک ایسا نبی پیدا ہوا جس کا پیام اب تک دنیا کو منور کر رہا ہے۔

تمہارے دروازے پر کوئی فاقہ زدہ آیا تھا۔ اسے تم نے دھکے دے کر بھگا دیا۔ تم کیا جانو کہ اس بھیس میں کون دیوتا تمہارا امتحان لے رہا تھا۔

ہمدم تیرے سینے میں حرص کی آگ سُنگتی رہی اور آنکھوں سے خود غرضی ٹپکتی رہی۔ ورنہ تو دیکھتا کہ تو فرشتوں سے قلبوں کا کام لے رہا ہے۔

درو دل ہی لذتِ حیات ہے۔

لیکن او دنی فطرت، اس جوہرِ انسانیت کو تو اپنے

نفس پر قربان کر رہا ہے۔

بچتے خبر نہیں کہ حرص و ہوا کا جنگل بچتے تیزی سے موت

کے غار کی طرف ڈھکیل رہا ہے۔

## گناہ

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں۔

سب گنہگار میرے ہی بھائی بہن ہیں۔

اور میں؟ — میں تو دریائے معاصی میں ڈوبتے تیرتے

پاپوں کا سردار ہوں۔

تینیس کر وٹ دیوتاؤں کے بارگتہ سے جہنم دبا جا رہا ہے۔ لیکن

انہیں کے نقش قدم پر چل کر ملائک نے بہشت کی راہ پہچانی ہے

آدم سے لے کر اندر الاسلام تک — ہر فرد بشر نے عذاب

کی چٹھری سے ثواب کا گلا ریتا ہے۔

یہ تو پاپوں کی بستی ہے۔

اس کے آدھے حصے پر خدا کی حکمرانی ہے اور آدھے پر

شیطان کی کار فرمائی۔

مذہبی دیوانو، سنو! دوسروں کی آنکھوں کا تنکا دیکھنے سے

پہلے اپنی آنکھوں کے شہتیر کو تو دیکھو۔

نیکی کے پودے پر صرن گناہ کے پھول کھلتے ہیں۔

اس جہانِ جیل میں فریب و معاصی کے سوا رکھا ہی کیا ہے

کوئی اوتار اور کوئی پیغمبر اپنے کو بے داغ نہ رکھ سکا۔

اس نے اپنی روح اگر ثواب کے سپرد کی تو اپنا جسم گناہ

کے حوالے کیا۔

ہمدم، یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ برہما، وشنو اور مہادیو

جیسے جُغادری — انسان کا ذکر ہی کیا ہے، بڑے بڑے رشی مہی  
— ان سب کی روح سے ریا ہو تو ہو، لیکن ان کے کالبند  
خاکی لہو و لعب کے پٹیلے تھے۔

یہ دنیا سیہ خانہ ہے جہاں خیر مذہب کی پیٹھ پر ثواب کا  
خوشنما پلان پڑا ہوا ہے۔

یہاں سب پڑانے پاپی ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک اپنے  
گناہ کے ترازو پر دوسروں کی بدکاریوں کو تولتا ہے۔  
چوٹی اور ڈاڑھی کے پردے میں کیا تم اپنی ریاکاری کو  
چھپا سکتے ہو؟

پولیس کا وجود جس طرف چوروں کی موجودگی کا پتا دیتا ہے  
اسی طرح یہ پُر فریب وضع تمھاری سیاہ کاریوں پر دلالت  
کرتی ہے۔



ایک روز فردوسِ بریں میں معصوم فرشتوں نے احتجاجی جلسہ  
کیا۔ موضوعِ بحث یہ تھا کہ اللہ میاں ہمارے عبادت سے تو  
بے نیاز رہتے ہیں لیکن ان کی تمام رحمت اس خاکی، عاصی ناری  
انسان کی طرف متوجہ رہتی ہے۔

یہ شکوہ خالق کے کانوں تک پہنچا تو اس نے مسکرا کر کہا کہ  
”اس خاک کے پٹیلے نے کہاں نازک دل پایا ہے، اس کی دنیا  
میں ہر پھول کانٹوں سے چھدا ہوا ہے۔“

ہر نین میں جادو ہے اور ہر لبِ لالیں زہرِ ہلاہل میں ڈوبا

ہوا ہے۔ وہاں صندل بھی تپ آرزو میں مبتلا ہے۔ اور چاند بھی  
یوسوں کی گرمی سے سیاہ پڑ رہا ہے۔

وہاں پر حسین آنکھوں میں کاجل لگائے گلے میں چندن ہار  
ڈاے پیروں میں مہندی لگائے ہونٹوں کو خون اکود کیے — عالم کو  
تہ و بالا کرنے کے درپڑ ہے۔

اس دنیا میں شیطانِ حق کی پوشش میں بلبوس ہے اور حق  
کی نگاہوں میں تیر ہی تو مسکراہٹ میں اتنی ہے۔  
یہ سن کر فرشتوں نے کہا کہ معبود ہمیں بھی ٹمک اس جہان  
کی سیر کرا دے۔ جہاں پھول اس لیے کھلتے ہیں کہ کھلائیں، مڑجھائیں  
اور بھر پیوند خاک ہو جائیں۔

دربارِ باری سے ارشاد ہوا کہ تم میں سے دو جو سب سے  
افضل ہیں اس خاک دان کی طرف جائیں اور فریبِ ہستی کا  
تماشہ دیکھیں۔

اجازت ملتے ہی ہاروت اور ماروت، ٹوٹے ہوئے ستاروں  
کی طرح آسمان سے زمین پر اترے۔

یہاں آکر کیا دیکھتے ہیں کہ ذرہ ذرہ دامِ ترویر ہے۔ پتا پتا  
نقشِ فریب ہے۔ آسمان پر تو فقط ایک ہی مہتاب جلوہ سماں ہے  
لیکن آپ دیا میں اس کی صدہا پرچھائیاں اتر آئی ہیں۔

یہاں کی ہر صدہ، ہر رنگ و بو حُسنِ خوںِ آشام کی تفسیر ہے۔  
جس گھاٹ پر دیکھو روپ کی نگری کھلکھلا رہی ہے۔ لیکن  
اس کی صدائے بازگشت ہانسری کے سروں میں فریاد بن گئی ہے۔

دو دن کے اندر ان آتش نفس فرشتوں کی رگ رگ میں مٹی  
 کا رس ساگیا اور ان کے دل ایک جادو نظر کے گرفتار ہو گئے۔  
 جب زہرہ لہنگا پھڑکا کر اور گلری چھلکا کر سامنے سے نکل گئی  
 تو ان غلہ نشینوں کے پیروں میں عشق کی زنجیر پڑ گئی۔  
 آتشِ جنم کا خوف لبِ شکر کی شیرینی میں سر ہو گیا۔  
 اور شرابِ کوثر کا لطف مٹی کے پیالوں کے آگے بیچ ہو گیا۔  
 وہ ریاضت اور عبادت کہاں گئی ہے اب خدا کے ان  
 جلیانِ خاص کو دیکھو کس مزے سے ساغر لٹھا رہے ہیں۔

ادھر اللہ میاں نے فرشتوں پر طعن کس کر کہا دیکھو زمینِ لیم  
 نے باروت اور ماروت کا کیا حشر کیا؟

ہم نشیں! یہاں ایک ایک جادو بھرے نین میں وہ قدرت  
 ہو کہ اس کے ایک اشارے کے سیل میں مڑوں کا زہر تنکے کی  
 طرح تہ جاتا ہے۔

مادرِ گیتی کا حُسن سدا بہار ہو  
 اور اس پر کسی جبار اور تہار کا حکم نہیں چلتا۔ بلکہ اس پر  
 محبت کا دیوتا اپنی رانی کے ساتھ فرماں روئی کرتا ہے۔

## طوائف

مجھے طوائف کہہ کر کون حقارت سے ٹھکراتا ہے؟ ممکن ہے تو سیتا جیسی کسی سستی کی بیٹی ہو۔

تو جو بھی ہو، ہماری ماؤں، بہنوں کی ہم عینس تو ہے۔  
تیرے بچے بھی ہم جیسے ہیں۔ شاید کہ ہمارا ہی کوئی ماموں اور  
چچا ان کا باپ ہو۔ کیا عجب کہ ان کے چہرے پر ان کا عکس رخ  
نظر آجائے۔ وہ بھی توقیر اور عزت حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی آواز  
بھی روح القدس سے ہم آہنگ ہو سکتی ہے۔ پیدائش کے بعد انک  
سے نفرت صریح کفر ہے۔

کیا گناہ کا مرتکب کبھی ثواب نہیں کر سکتا؟ اگر اہلبیا کو نجات  
حاصل ہو سکتی تھی اور میرٹھی عصمت کی دیوی بن سکتی تھی تو

لہ "اہلبیا" گوتم رشی کی حسین و جمیل بیوی تھی جس پر انڈر دیوتا سو جان سے فریفتہ  
ہو گئے۔ ان دونوں کی خفیہ محبت کا پتہ چلنے پر رشی جی نے اہلبیا کو بد دعادی کہ  
پتھر کی صورت بن جا۔ جب رام چندر جی کے پیر اُس پر پڑے تو اس نے پھر انانیت کا  
جامہ پہنا ۱۲

لکہ "میرٹھی" ایک فاحشہ عورت تھی جسے زنا کاری کے جرم میں لوگ سنگسار کرنا چاہتے  
تھے۔ جب انہوں نے مسیح سے اجازت چاہی تو انہوں نے جواب میں وہ معرکہ آلا راجہ  
کہا۔ "جس کسی نے کبھی گناہ نہ کیا ہو پہلے وہ اس پر پتھر پھینکے" بعد ازاں اس  
عورت نے اپنی ایسی اصلاح کی کہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے۔

تو بھی حق و صداقت کی راہ پر چل کر قابلِ عزت بن سکتی ہے۔  
 تیری اولاد کو جو لوگ نطفہٴ نامحقیق کہہ کر ٹھکراتے ہیں ان سے میں  
 پوچھوں گا کہ ای نیکی کے فرشتو! دنیا والوں میں سے کتنوں نے  
 جذبہٴ شہوت کو ٹھکرایا ہے؟ ان میں سے کتنے گناہ سے پاک تھے؟ ہم سب  
 کو اسی شہوانی بھوک نے جنم دیا ہے۔ لیکن کوئی ہمارے عذر کو تو  
 دیکھے۔

نطفہٴ محقق ہو یا نامحقیق — وہ شہوت کا ہی انجام ہوتا ہے۔  
 اگر عصمت فزوش ماں کا بیٹا حرامی ٹھیرا تو شہوت پرست باپ  
 کا بیٹا بھی یقیناً حرامی کہلائے گا۔

## عورت

میری نگاہ میں مرد عورت سب برابر ہیں۔  
دنیا کی حسنت اور جلال کی تعمیر میں عورت کا بھی اتنا ہی  
ہاتھ ہی جتنا مرد کا۔

سوز و ساز، تپش اور خلش، آگ اور آنسو۔ ان کی تخلیق  
میں مرد کا اتنا ہی حصہ ہی جتنا عورت کا۔

دیوی! تجھے گناہ کا سبب کون بتاتا ہے؟ کہہ دے گناہ کا  
تخم پونے والا اہلیس مرد ہی کا ہم جنس تھا۔ یا یوں کہو کہ نہ وہ  
مرد ہی نہ عورت بلکہ خواجہ سرا ہے۔ اور دونوں میں مل جل کر رہتا ہے۔  
اس جہان میں جتنے پھول کھلتے ہیں، جتنے شجر اُبھرتے ہیں  
عورت نے ہی ان میں رنگ و بو شیرینی اور لطافت پیدا کی،  
روح پھونکی۔

ہم نشیں! تاج محل کو بھی غور سے دیکھا ہے؟ اندر ممتاز  
سوتی ہے، باہر شاہجہاں آرام کر رہا ہے۔  
عورت دل ہے، مرد جسم ہے۔

اگر مرد سورج کی تپش اور بادِ سموم کا جھوٹکا ہے، تو عورت  
چاند کی کرن اور نسیم صبحِ گاہی ہے۔

اگر مرد تشنہ لب صحرائی ہے تو عورت جامِ کوثر ہے۔ مرد نے  
ہل چلایا، عورت نے پانی سے سینچا۔ ان دونوں کے سچوگ سے

کھیتی لہلہا اُٹھی۔

سونے اور چاندی کی زنجیریں عورت کے جسم سے چھو کر حسین  
زیوروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔  
عورت ہی نے شاعری کی بنا ڈالی اور عورت کے ہر لفظ کو  
موسیقی میں بدل دیا۔

عورت سنسبیل ہے۔ مرد مجسم پیاس ہے۔  
پانی اور پیاس ان دونوں کے میل سے نیا آدم پروان  
جڑھتا ہے۔

مرد کی ہر فتح اور نصرت عورت کی قربانی کی منت پذیر ہے۔  
تاریخ یہ تو بتاتی ہے کہ کس جنگ میں مردوں نے کتنا خون بہایا  
لیکن یہ کون بتلائے گا کہ اس کے لیے عورتوں نے کس طرح  
اپنا سہاگ اُجاڑ دیا؟

ماں نے جگر پاروں کو کیسے نکال پھینکا؟ شجاعت کی داستانوں  
میں کہاں لکھا ہے کہ فلاں فاتح کی تلوار کو عورت کی ہمت افزائی  
نے برق دم بنا دیا تھا۔ راجہ پر جا پر حکومت کرتا ہے مگر راجہ پر  
رانی راج کرتی ہے۔ ملکہ کی محبت، حاکم کی فحوت کو دھوتی ہے۔  
ای بے درد مرد سُن، کہ عورت نے اپنا خون دے دے کر  
تجھے زندگی سے مالا مال کیا ہے، تاریخ جن لوگوں کے نام پر داری  
قربان ہوتی ہے وہ سب خود فراموشی کے ایک لمحہ میں پیدا ہوئے تھے۔  
عباس یاپوں کے ذہن میں ان کا تخیل بھی نہ تھا۔

ماں کی مامتا بچے کو رحم و کرم، الفت و محبت کا سن پڑھاتی ہے۔

مرد کی وفا نا آشنا آنکھوں میں عورت ہی درد مندی کا کاحبل  
لگاتی ہے۔

لیکن مرد کی احسان فراموشی تو دیکھو وہ عورت سے کس طرح  
پیش آتا ہے۔ جس نے اسے گود میں کھلایا اس کا گلا گھوٹتا ہے۔  
جس شخص نے اپنے باپ کا حکم مان کر اپنی ماں کو قتل کر دیا  
اسے انسان ادا نہ سمجھ کر پوجتا ہے۔

لیکن سُن رکھو اب وہ دن بیت گئے جب عورت مرد کی  
پابند تھی۔

یہ مساوات، انسانیت اور اشتراکیت کا زمانہ ہے۔  
بادِ صبا یہ پیغام لائی ہے کہ غلامی کے سب بندھن ٹوٹ رہے  
ہیں۔ اب نہ کوئی غلام ہی نہ غلام فروش۔ اگر مرد عورتوں کو قید  
رکھنے کی کوشش کرے گا تو وہ دن دور نہیں کہ یہ طوق خود اس  
کے گلے کا پھندا بن جائے گا اور وہ آپ اپنے دام میں تڑپتا ملے گا۔  
دورِ حاضر لٹکا کر کہ رہا ہے کہ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودیں گے  
وہ خود اسی میں گر کر میٹ جائیں گے۔  
اوٹھی کے بلبلو، عورت پر جتنا تشدد روا رکھو گے اسی قدر  
نامرد ہوتے جاؤ گے۔

عورت بتا تو سہمی، ان سنہری روپلی بیڑیوں میں بچے کس نے  
جکڑ رکھا ہے؟

لہ پرین رام جنوں نے اپنے باپ کا حکم پا کر اپنی ماں کو قتل کیا تھا ۱۲

یہ کیوں ہے کہ اب تو اپنی جھجک سے آپ بھڑکتی ہے اور تیری آواز اس خیال سے کانپتی ہے کہ اسے کوئی سن نہ لے۔

آج تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ بھی نہیں سکتی۔ تیرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے، پانوں میں بیڑی اور چہرے پر گھونگھٹ۔

عورت، کب تک تو اس ظلم کو برداشت کرے گی۔ توڑ دے ان پابندیوں کو، بھل آ اس زنداں سے! یہ زیور تیری غلامی کے تنے ہیں، انھیں مردوں کے مُٹھ پر پھینک دے۔

مادری گیتی کی لاڈلی بیٹی، پہاڑ اور جنگل کیوں اب تیری آواز سے نہیں گو بجاتے؟

کیا یونانی سج کہتے ہیں کہ موت کا فرشتہ ایک روز تجھے اپنے اندھیرے تہ خانے میں قید کر آیا تھا؟

ہاں ہاں، یہی ہوا تھا، تو روزِ ازل کی زندانی ہو۔ لیکن تو ڈرتی کیوں ہے، جب تو اپنے قید خانے کی دیواروں کو توڑ کر مچھلے گی تو تیری چوڑیاں تاریک رات سے کو اُجال دیں گی۔ مرد جو عزائیل کا کتا ہے، اپنے مالک کے ساتھ تیرے قدموں پر لوٹا نظر آئے گا۔

عورت! اپنے نازک ہاتھوں سے دنیا کو آج تک تو نے امرت کے پیالے پلائے تھے، لیکن اب انھیں ہاتھوں سے سیم قائل پلا دے! پھر وہ دن دور نہ ہوگا جب آسمان مرد کے ساتھ عورت کا بھی جیکار مٹانے لگے گا۔

## ڈاکو

بھائی تجھ پر جو چوری کا الزام لگاتا ہے اسے یہ نہیں معلوم  
کہ آج یہی قانونِ کائنات ہے۔ حکومت منظم ڈکیتی نہیں تو اور  
کیا ہے۔

کون ہے وہ خدائی فوج دار جو چوری کی پُرائیوں پر وعظ  
کہہ رہا ہے؟

اس سے کہو کہ دنیا سے ایک بھی فرد بشر نکال کر لاوے  
جو ڈاکو نہیں ہے۔

منصف صاحب! ان قانونوں کے پوتوں کو طاق پر رکھے۔  
غریبوں کی جیب کاٹ کاٹ کر آج یہ سرمایہ دار جاہ مند  
بنے پھرتے ہیں۔

جو شخص جتنا بڑا بے ایمان، فریبی اور جعل ساز ہے ہمارے  
ساج میں اتنا ہی معزز اور ہوشیار سمجھا جاتا ہے۔  
رعایا کی ہڈیوں سے راج کے محل کی اینٹیں اور رعایا کے  
خون کا گارا تیار ہوتا ہے۔

حریص سرمایہ داروں کے کارخانے غریبوں کی محنت سے تیار  
ہوتے ہیں۔ ان کی مشینیں غریبوں کے خون سے چلتی ہیں۔  
مگر ان کے چلتے ان گزت انسان بے کار ہو کر در در مارے  
مارے پھرتے ہیں۔

بے شمار انسانوں کو انسانیت کے حقوق سے محروم کر کے مل کا مالک شغلی ناو نوش میں مست رہتا ہی اور سونے کے تاروں سے مکرہی کا جالا بنتا ہی۔

مہاجن کی تو نذا اسی وقت بڑھ سکتی ہی جب غریب بھوکے رہیں اور زمیندار اسی حالت میں آرام کر سکتا ہی کہ غریب کی جھونپڑی کا ویا بچھ گیا ہو۔

دنیا میسواہی، گناہ رقص ہی، دولت سرود ہی، سرمایہ دار متاشائی ہی۔

روٹی، صحت، اُمید اور زبان —

انسان ان سب نعمتوں سے محروم ہی اور تباہی کی طرف بھاگا جا رہا ہی۔

اور کوئی رستہ نہیں ہی — کیونکہ سرمایہ داری نے ہر ہر قدم پر گڑھے کھود رکھے ہیں۔

سارا جہان زندہ ہی اور ڈاکو اس کے پہرے دار ہیں۔ چوروں نے مالکوں کو قید کر رکھا ہی کہ کہیں وہ باہر نکل کر اپنا مال چھین نہ لیں۔

ہمدام! کون کہتا ہی کہ تو چور ہی، کون کہتا ہی کہ تو ڈاکو ہی۔ تو نے ایک سمٹی اناج کی چوری کی ہی۔ دلوں کا خون کیا ہی۔ وہ بھی ہیں جو چوری نہیں کرتے تاہم انسان نہیں ہیں۔ تو نے چوری کی ہی پھر بھی انسان ہی۔

## حاکم اور محکوم

میں مساوات کے گیت گاتا ہوں جسے سن کر درد انسانی  
سب کو ایک بار ہن گونڈھ دیتا ہے۔

اتنی سیدھی سادی بات ہے کہ جب سب ایک ہی ماں کی  
اولاد ہیں تو ان میں سے کوئی حاکم اور کوئی محکوم کیوں ہو۔  
لیکن لوگو! یہ تماشہ دیکھو اس سیدھی سی بات کو کوئی زور  
سے کہ دے تو وہ بعادت کا مجرم ٹھیرتا ہے۔

رعایا تو حاکم کی باغی کہی جاسکتی ہے لیکن اگر حاکم ظالم ہو  
تو رعایا کا باغی نہیں کہا جاسکتا۔

پہ جا ہی راجہ کا خالق ہے۔ راجہ رعایا کو پیدا نہیں کرتے۔  
لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ رعایا کی حالت غلاموں سے  
بھی بد تر ہے۔

امن و امان کی قیمت ہم نے اپنی آزادی کی صورت میں  
ادا کی ہے۔

کس سے فریاد کریں کہ ہم اپنے ہاتھوں محل بناتے ہیں لیکن  
خود بے خانماں ہیں۔

جن کے لیے حکومت قائم ہوتی ہے حکومت پر ان کا ہی زور  
نہیں چلتا۔

راجہ اور دیوتا ہمارے منہ کا نوالہ کھا جاتے ہیں اور ہم

خود بھوکے مرتے ہیں۔

مگر یہ فریاد کس سے کیجیے۔ بھلا اسی میں ہی کہ ہم ”حکومت زندہ باد“ کے نعرے بلند کرتے ہیں۔

عدالت رعایا کے گناہوں کی سزا کے لیے ہی۔ حاکم تو انصاف سے بلند ہی۔

وہ دیکھو نفاۃٴ جنگ پر چوب پڑی !

نوزہال ہنستے ہوئے توپوں اور تلواروں پر گر پڑے اور

انہیں اپنے معصوم خون کے چھینٹے دیتے لگے۔

فتح کا ناقوس بجتا ہی اور اس کی صدائے بازگشت بیواؤں

کی آہ اور یتیموں کی کراہ میں سنائی دیتی ہو۔

لیکن شادمانی کا ڈھول پیٹے جاؤ کیونکہ فتح کی دیوی کا

رتھ گزرنے والا ہے۔

کیا کوئی بہن اپنے بھائی کے لیے ماتم کر رہی ہے؟

کیا کوئی ماں اپنے لختِ جگر کو رو رہی ہے؟

میدانِ جنگ سے اکلوتا میٹا نہیں لوٹا؟

شہرِ موت کا شکار ہو گیا؟ بھائی کی خیر نہیں ملی؟ تو

کیا ہوا؟ یہ سب شہید ہو گئے!! ان سب نے جامِ بقا پیا ہے۔

پریشان نہ ہو کیوں کہ ہماری حکومت فتح یاب ہوئی ہے!

غناں اور فریاد کا کیا موقع ہے؟

فتح اور نصرت کا پرچم بلند کرو! یاد شاہ زندہ باد کا نعرہ لگاتے

نقارے پر ضرب لگاؤ۔

دیکھو تو سہی کہ حضور پُر نور کتنے عرصے کے بعد حرم سرا سے  
باہر تشریف لائے ہیں۔

ان زخمی سپاہیوں کی دیدہ دلیری تو دیکھو کہ نفل اللہ کی  
سواری کے آگے سے نہیں ہٹتے !!

یہ اندھے ہو گئے ہیں تو کیا ہوا؟ جاں بلب ہیں تو کیا؟  
حکومت کی فتح! بادشاہ کی کامرانی!

ہدم، رعایا کا خون بہتا ہے، لیکن فتح حاکم کی ہوتی ہے۔  
اسی کا نام دُنیا ہے۔

سرکاری نوکروں کی تتخواہ رعایا کی جیب سے جاتی ہے۔  
لیکن وہ حاکم کے نوکر ہیں، محکوم پر تشدد کرنے کے لیے۔

رعایا کے نوکر رعایا پر ظلم کرنے کے لیے — کیا بوالعجبی ہے!

لیکن آسمان کروٹ بدل رہا ہے۔ یہ امید امید موهوم نہیں

ہے کہ بہت جلد کائنات کا ہر ذرہ محکوموں کی فتح کے ترانے  
گائے گا۔

## مزدور

اُس روز ریل میں دیکھا۔ ایک ثقی کو بابو صاحب نے دھکا دے کر نیچے گرا دیا۔

یہ دیکھ کر دل بھر آیا، آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کیا دنیا میں غریب ہمیشہ یوں ہی ذلیل ہوتے رہیں گے؟

جو مزدور اپنے گوشت اور پوست کے ایندھن سے ریل چلاتا ہے تو وہ تو خود پٹریوں پر پڑا ہوا ہے۔ ریل پر بڑے لوگ بیٹھتے ہیں۔

کیا کہا "تخواہ دیتے ہیں" منافقو! کہتے شرم نہیں آتی۔ مزدور کو چند پیسے دے کر تم نے دولت کے انبار لگا لیے ہیں۔

سرطکوں پر موٹر، سمندر پر جہاز، فضا میں طیارے، شہروں میں معین یہ سب کس کے بنائے ہوئے ہیں اور کون انہیں چلاتا ہے؟ اور کون انہیں چلاتے ہیں؟

بھاریے قصر و ایوان کس کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی ایک ایک اینٹ پر کس کا افسانہ درد کندہ ہے؟ خاک کے ایک ایک ذرے کو اس جاہ و جلال کا اصل راز معلوم ہے۔

## نعرۃ انقلاب

وہ مبارک ساعت آہنچی -

قرض میں روز افزوں امانہ ہو رہا ہے، اسے فوراً بے باق کرنا ہے۔

ہٹوڑی اور گڈال سے جو آسمان پوس پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے

دہستوں کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں  
تھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ

اختیار کیا ہے

تھاری بار برداری کے بے چہرے جو ہمیشہ خاک آلود رہتا ہے  
وہی صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔

میں اس کے گیت گاتا ہوں -

اس کا دکھا ہوا دل ایک نئی زندگی کی تعمیر کرے گا۔

یہ توقع نہ رکھو کہ یہ خاک نشیں صرف اسی وجہ سے تھاری

توقیر کریں گے کہ بالا نشیں ہو۔

جو لوگ فرطِ محبت سے زمین کو ہی اپنا اور ہٹنا بچھونا بناتے

ہیں اب یہ زمین اپنے کو انھیں کے سپرد کرے گی۔

میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن میں یہ خاکِ پاک

خود بخود لپٹ جاتی ہے۔

آج مظلوموں اور بے کسوں کے خون میں رنگ کر بطن گیتی  
سے آفتابِ تازہ پیدا ہوا ہے۔

اب تمام بندھنوں اور بندشوں کو توڑ کر پھینک دو۔  
فلکِ کج رفتار کو چاہیے کہ پاسِ پاس ہو کر ہمارے آشیانے  
پر گر پڑے۔

ہمارے سر پر چاند اور ستارے پھول بن کر برس پڑیں  
کہ ہم نے ایک جہانِ نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔  
ساری دنیا کے انسان سن لیں کہ ہم سب ایک ہی  
کارواں کے مسافر ہیں۔

اگر ایک کو تکلیف ہوگی تو سب کے دل اس کی کھٹک  
محموس کریں گے۔ ایک کی توہین بنی نوع انسان کی توہین ہے  
ایک نئی دنیائے ارمالوں اور نئے مقصدوں کے ساتھ  
راہِ حیات پر گام زن ہو رہی ہے جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے  
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔

ختم شد

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu Series No. 123.

# PAYĀM-I-SHABĀB

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Translation of  
QAZI NAZRUL ISLAM'S BENGALI POEMS

Compiled by  
SYED AKHTAR HUSAIN RAIPURI

---

The Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India),

DELHI

---

1939













